قرآن مجید کے چند اُردو تراجم کا موضوعاتی تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے

پی۔ایچ۔ڈی مطالعات ترجمہ

سال 2013-2018

اندراج نمبر: A160985

مقالہ نگار

سیدہ عائشہ پروین

نگران

ڈاکٹر محمد خالد مبشر الظفر

شعبۂ ترجمہ

اسکول برائے السنہ، لسانیات وہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی۔ حیدرآباد

D E C L A R A T I O N

I do hereby declare that this dissertation entitled "**QURAN MAJEED KE CHAND URDU TARAJIM KA MAUZUATI TAQABULI MUTALA'A**" (Thematic Comparative Study of Some Urdu Translations of the Holy Quran) is the original research carried out by me. No part of this dissertation was published, or submitted to any other University/Institution for the award of any Degree/Diploma.

(Signature & Name of Research Student)

Syeda Ayesha Parveen

Place: Hyderabad

Date:

C E R T I F I C A T E

This is to certify that the dissertation entitled "**QURAN MAJEED KE CHAND URDU TARAJIM KA MAUZUATI TAQABULI MUTALA'A**" (Thematic Comparative Study of Some Urdu Translations of the Holy Quran), submitted for the award of the Degree of Doctor of Philosophy in Translation, School of Languages, Linguistics and Indology, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, is the result of the original research work carried out by Mrs. **Syeda Ayesha Parveen** under my supervision and to the best of my knowledge and belief, the work embodied in this dissertation does not form part of any thesis /dissertation already submitted to any University/Institution for the award of any Degree/Diploma.

Head

(Department of Translation)

Signature of Research Supervisor

Dr. Mohammed Khalid Mubashiruz Zafar

Place: Hyderabad

Date:

Dean

(School of Languages, Linguistics and Indology)

فہرستِ ابواب

مقدمہ 7

باب اول: موضوع کا تعارف، ضرورت واہمیت

تقابلی مطالعہ کیا ہے؟ 12

موضوعاتی مطالعہ 14

موضوعاتی تقابلی مطالعہ 14

موضوعاتی تقابلی مطالعہ کے اطلاقات 15

موضوعاتی تقابلی مطالعہ کی ضرورت واہمیت 16

قرآن کے اہم موضوعات 16

قرآن کے اردو تراجم کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت واہمیت 19

قرآن مجید کے اردو تراجم کا موضوعاتی تقابلی مطالعہ: چند عملی پہلو 20

قرآن مجید کے اُردو تراجم کے تقابلی مطالعات: ایک تاریخی جائزہ 22

باب دوم: قرآن اور ترجمہ

قرآن کا تعارف 30

قرآن کی زبان 33

قرآن کا اسلوب 38

قرآنی اسلوب کی انفرادیت 41

قرآن کا اعجاز اور اس کے اعجازی پہلو 44
قرآن کا چیلنج 48
ترجمہ کا فن اور مشکلات 58
کیا قرآن کا ترجمہ ممکن ہے؟ 61
ترجمہ قرآن کی ضرورت واہمیت 62
اُردو میں ترجمہ قرآن کی مختصر تاریخ 70

باب سوم: منتخب مترجمین کا تعارف

مولانا احمد رضا خان بریلویؒ 80
مولانا محمد جونا گڑھیؒ 83
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ 87
مولانا محمود حسنؒ 90

باب چہارم: قرآنی تمثیلات کے تراجم کا تقابلی مطالعہ

تمہید 101
منافقین کی مثال 106
حق اور باطل کی مثال 109
زندگی بعدِ موت کی مثال 114
دُنیوی زندگی کی مثال 118
مؤمن اور مشرک کی مثال 119

شرک کی مثال 121
اللہ کے نور کی مثال 124
کفّار کے اعمال کی مثال 128

باب پنجم: آیاتِ انفس وآفاق کے تراجم کا تقابلی مطالعہ

تمہید 134
کائنات کا ارتقاء 142
پہاڑوں کی ساخت 145
تخلیقِ کائنات 148
کائنات کا پھیلاؤ 151
بحریات 154
نباتات میں جوڑے 157
انسانی تخلیق کے مراحل 159
جنس کا تعین 161

باب ششم: آخرت کے بیان سے متعلق آیات کے تراجم کا تقابلی مطالعہ

تمہید 168
جنّت کا منظر 170
جہنّم کا منظر 176
قیامت کا منظر 179

مراحلِ قیامت 183

زندگی بعدِ موت 187

باب ہفتم: قرآنی احکامات کے تراجم کا تقابلی مطالعہ

تمہید 193

نماز 194

جہاد 198

قتال کا حکم 202

پردہ (دو آئتیں) 206

سود 212

اختتامیہ 219

کتابیات 231

مقدمہ

قرآن مجید کی تشریح، تفسیر اور تفہیم کا سلسلہ عہدِ نبوی ﷺ سے جاری ہے۔ عربی کے علاوہ دنیا کی سینکڑوں زبانوں میں اس کے تراجم و تفاسیر اس بات کی نشاندہی کے لئے کافی ہیں کہ تفہیمِ قرآن کی کتنی ضرورت واہمیت ہے۔اس اہمیت کے پیشِ نظر اب تک اُردو میں بھی مکمل اور جزوی ایک ہزار سے زائد تراجم ہوئے۔ برّصغیر میں بھی قرآن مجید کے اُردو تراجم، قرآن فہمی کا سب سے اہم اور بڑا ذریعہ ہیں۔

ہر مترجم کا ترجمہ اندازِ بیان، الفاظ کے انتخاب اور مفہوم کی ترسیل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر ترجمہ اپنے عہد کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ مترجم کے نقطہ نظر اور علمی وادبی ذوق کا بھی ترجمان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، ہر ترجمہ میں کچھ محاسن اور کچھ کمزوریاں بھی ضرور ہوتی ہیں۔

اس مطالعہ میں جن اُردو تراجم کا انتخاب کیا گیا ان میں مولانا محمود حسنؒ، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا محمد بن ابراھیم جوناگڑھیؒ کے تراجم شامل ہیں۔ زیرِ نظر تحقیق میں ان تراجم کا جائزہ ایک نئے طرز سے کیا گیا جس میں مختلف قرآنی موضوعات جیسے قرآنی تمثیلات، آیاتِ انفس و آفاق، احکامات اور آخرت کے بیان کو بنیاد بنا کر مختلف پیمانوں جیسے الفاظ کے انتخاب، مفہوم کی بہتر ترسیل، مترجم کی فکر اور ماحول کا اثر وغیرہ کے لحاظ سے منتخب تراجم کا تقابلی تجزیہ کیا گیا۔

یہ تقابلی مطالعہ مترجمین کے درمیان موازنہ کرنے یا کسی ایک مترجم کو دوسرے پر فوقیت دینے کی غرض سے نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی کسی ایک ترجمہ کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے بلکہ ہر مترجم کا یکساں احترام کرتے ہوئے بالکل غیر جانبداری کے ساتھ مختلف تراجم میں اختلاف کے گوشوں کا جائزہ لے کر فہمِ قرآنی اور قرآنی محاسن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے جن مترجمین کا انتخاب کیا ہے وہ تمام ہی اپنے عہد پر اثرانداز ہونے والی بلند پایہ شخصیتیں ہیں۔ امید ہے کہ میری یہ کاوش بین مسلکی رواداری کا پیغام دے گی اور ہر مترجم کی کاوشوں کو احترام اور مستحسن نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ساتھ ہی اس میں یہ پیغام بھی ہے کہ ترجمہ کتنا ہی بہتر کیوں نہ ہو قرآن کے تمام محاسن ترجمہ میں نہیں سموئے جاسکتے اور ترجموں پر نظرثانی اور ان میں بہتری پیدا کرنے کی مسلسل کاوشیں ہمیشہ درکار ہوتی ہیں۔

یہ مطالعہ ایک طرف عوام الناس کو اس بات پر آمادہ کرے گا کہ وہ کسی ایک ترجمہ قرآن کو پڑھنے اور اسی کو ترجیح دینے کے بجائے مترجم کے تئیں عقیدت سے بالاتر ہو کر مختلف تراجم کا مطالعہ کریں تاکہ قرآنی محاسن ان پر مزید واضح ہوں تو دوسری طرف علماء اور مختلف مضامین کے ماہرین سے اپیل کرتا ہے کہ آپسی مشاورت و معاملت کے ذریعہ ایسے ترجمہ کو وجود میں لایا جائے جس میں قرآن کی زیادہ سے زیادہ خوبیاں سما سکیں۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مقالہ نگار تمام مترجمین کا یکساں احترام کرتی ہے۔ مقالہ میں مترجمین کے مکمل نام نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ کثرتِ استعمال کی وجہ سے اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اسے مترجمین کے تئیں بے ادبی یا سوء ظنی پر محمول نہ کیا جائے بلکہ تحقیقی اسلوب کی مجبوری تصوّر کیا جائے۔

میں اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان بجالاتی ہوں جس نے مجھ ناچیز کو صحت و صلاحیت بخشی اور اس بات کی توفیق عطا فرمائی کہ میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا سکوں۔ یہ بات میرے لئے موجبِ مسرت ہے کہ میں ان بہی خواہوں کا بھی شکریہ ادا کروں جنھوں نے مقالہ کی تکمیل میں میری مدد و رہنمائی فرمائی۔

میں اپنے گائیڈ ڈاکٹر محمد خالد مبشر الظفر صاحب کی نہایت مشکور ہوں جنھوں نے موضوع کے انتخاب میں رہنمائی فرمائی اور دورانِ تحقیق اپنی نگرانی اور مفید مشوروں کے علاوہ اپنی ذاتی لائبریری سے استفادہ کرنے کی سہولت دی۔ مزید، اس مقالہ کی بروقت تکمیل میں مکمل تعاون کیا۔

میں شعبہ کے استاد ڈاکٹر فہیم الدین احمد صاحب کی بھی مشکور ہوں جنھوں نے مقالہ کی تیاری میں مفید مشوروں سے نوازا اور اس کی ترتیب و تصحیح میں رہنمائی کی۔

شعبۂ ترجمہ کے دیگر اساتذہ پروفیسر محمد ظفر الدین صاحب، ڈاکٹر محمد جنید ذاکر صاحب، ڈاکٹر سید محمود کاظمی صاحب اور ڈاکٹر کہکشاں لطیف صاحبہ کی بھی مشکور ہوں جنھوں نے مقالہ کی ترتیب میں تجاویز سے نوازا۔

میں شعبہ کے دیگر عملہ کے افراد شیخ نوید اور محمد عرفان کی بھی میں مشکور ہوں کہ وقتاً فوقتاً ان کا مختلف مرحلوں پر مجھے تعاون حاصل رہا۔

میں شعبۂ ترجمہ کے ان تمام ریسرچ اسکالرس کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالہ سے متعلق کسی بھی قسم کا تعاون کیا۔ بالخصوص، سید ماجد علی بھائی کی مشکور ہوں جنھوں نے دیگر امور میں معاونت کے ساتھ ساتھ مقالہ کے پروف خوانی بھی کی۔

میں محترم سید حامد عبدالرحمٰن الکاف اصلاحی صاحب کی بہت مشکور ہوں جنھوں نے اپنی سن رسیدگی اور تفسیرِ قرآن کی مصروفیت کے باوجود میرے لیے وقت نکالا اور عربی زبان کی تعلیم کے ساتھ مقالہ لکھنے میں قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ ہر آیت کے تحقیقی نتائج میں نے ان سے بیان کیے جس کی انھوں نے تصحیح و تصدیق فرمائی۔ اللہ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔

میں اپنے خاوند جناب محبوب الحق کی بہت مشکور ہوں جنھوں نے اس تحقیقی سفر میں ہر حال میں میرا ساتھ دیا، نامساعد حالات میں میری ہمت افزائی کی اور کتب و مصادر کی فراہمی اور مقالہ کی ٹائپنگ و طباعت میں تعاون کر کے بڑی آسانیاں پیدا کیں۔

میرے اس کام کے تکمیل کو پہنچنے میں والدین کی دعاؤں کا بھی دخل ہے۔ یہ بڑی ناقدری ہو گی اگر میں اپنی بڑی بہن سیدہ نسیم فاطمہ کا شکریہ نہ ادا کروں جنھوں نے آخری مراحل میں میرے بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے مجھے ریسرچ پر مکمل توجہ مرکوز کرنے کی سہولت دی۔ اللہ ان تمام بہی خواہوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

آخر میں اپنے عجز کا اعتراف کرتی ہوں اور مقالہ کی تحریر میں جو بھی کامیابی ملی وہ سب اللہ رب العزت کا فضل و کرم ہے اور اگر کچھ خامیاں و کمزوریاں رہ گئی ہیں تو اللہ سے دعا ہے کہ وہ میری غلطیوں و کوتاہیوں کو درگزر فرمائے۔

وماتوفیقی الا باللہ۔

سیدہ عائشہ پروین

19 مارچ 2018ء

باب اول

موضوع کا تعارف، ضرورت و اہمیت

سماجی تحقیق میں تقابلی مطالعہ کی روایت بہت قدیم ہے جو بین تہذیبی مطالعہ کے لئے عرصہ سے استعمال ہو رہا ہے۔اس کی جڑیں قدیم یونانی دور سے ملتی ہیں۔انیسویں صدی سے تقابلی تحقیق کے مختلف طریقے رائج ہوئے جن کو مختلف میدانوں کے ماہرین نے کچھ خاص مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔Linda Hantrais لکھتی ہیں:

"The comparative approach to the study of society has a long tradition dating back to Ancient Greece. Since the nineteenth century, philosophers, anthropologists, political scientists and sociologists have used cross-cultural comparisons to achieve various objectives." [1]

تقابلی مطالعہ کیا ہے؟

دو یا دو سے زائد افکار، مضامین، اشخاص، ادوار یا علاقوں کے مابین یکسانیت (Similarity) یا اختلاف (Difference) کے مطالعہ کا نام تقابلی مطالعہ ہے۔آفتاب حسن بخاری نے اپنے مضمون میں ہائیڈن ہیمر، ہیکلو اور آدم کا یہ قول نقل کیا:

"Comparative research is the act of comparing two or more things with a view to discovering something about one or all of the things being compared. The technique often utilizes multiple disciplines in one study." [2]

تقابلی تحقیق ایک ایسا عمل ہے جس میں دو یا دو سے زائد اکائیوں کا تقابل اس مقصد سے کیا جائے کہ کسی ایک یا تمام تقابل کی جانے والی اکائیوں سے متعلق حقائق کا انکشاف کیا جائے۔ یہ ایک ایسی تکنیک ہے جس میں واحد مطالعہ میں مختلف شعبۂ جات سے مدد لی جاسکتی ہے۔

Esping Anderson کے مطابق تقابلی مطالعہ کئی بنیادوں پر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں دو اہم عناصر علاقہ (Location) اور ادوار (Time) ہیں [3]۔ علاقہ کی بنیاد پر جو تقابل کیا جائے ان میں دو ملکوں کے درمیان یا ایک ملک کے دو مختلف مقامات، ان کی تہذیبوں یا حکومتوں کے مابین تقابل شامل ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی تہذیب یا ایک ہی ملک کے مختلف ادوار کے درمیان بھی تقابل کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے تجزیہ میں کسی واقعہ یا مسئلہ کا بتدریج ارتقاء دیکھا جاتا ہے۔

تقابلی مطالعہ کی مختلف تعریفات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ، تقابلی مطالعہ:

1۔ دو یا دو سے زائد مضامین یا افکار کے مابین یکسانیت یا اختلاف کو واضح کرتا ہے۔

2۔ دو یا دو سے زائد مضامین کے درمیان تعلق (Relationship) کی نوعیت کا تجزیہ کرتا ہے۔

3۔ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا دو مضامین یا افکار ایک دوسرے کے متضاد (Contradictory) ہیں یا ایک دوسرے کی اضافہ شدہ (Extended) شکل ہیں۔

4۔ ماضی کے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے حال اور مستقبل کے امکانی واقعات کی توضیح کی جاتی ہے۔

5۔ دو یا دو سے زائد مضامین کے درمیان علت و معلول (Cause and Effect) کے تعلق کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

6۔ دو یا دو سے زائد یکساں نوعیت کے گروہ (Similar Groups)، افراد (People) یا حالات (Conditions) کو تقابل کے ذریعہ پرکھا جاتا ہے، اس کے علاوہ منفرد خصوصیات کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

تقابلی مطالعہ میں کسی واقعہ، مضمون یا مسئلہ کے ہر پہلو پر غور و فکر ، گہرے مطالعے اور تفہیم (Explanation) کے ذریعہ کچھ ایسے نتائج اخذ کرنا ہوتا ہے جس کا مقصد ماضی کے واقعات کی روشنی میں حال یا مستقبل کے امکانات کی توضیح کرنا ہوتا ہے۔

تقابلی مطالعہ کے بعد اب ہم یہ دیکھیں گے کہ موضوعاتی مطالعہ کیا ہے۔

موضوعاتی مطالعہ

موضوعاتی مطالعہ معیاری تحقیق (Qualitative Research) کا ایک معروف طریقہ ہے جس میں متن سے مخصوص موضوعات (Themes) کا انتخاب کیا جاتا ہے اور ان موضوعات کی بنا پر متن کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔Dr. Aude Bicquelet کے مطابق:

> "Thematic Analysis is a research method for the interpretation of the content of text through the systematic classification of themes or patterns." [4]

یعنی موضوعاتی مطالعہ تحقیق کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں مخصوص موضوعات (Themes) یا نمونوں (Patterns) کی بنیاد پر متن کی تشریح کی جاتی ہے۔

موضوعاتی تقابلی مطالعہ

موضوعاتی تقابلی مطالعہ معیاری تحقیق کا ایک ایسا میدان ہے جہاں پر ایک موضوع کو لے کر زمانی و مکانی (Time and Space) بنیادوں پر تقابل کیا جاتا ہے۔ Ron Scollon اور Suzie Scollon کے مطابق:

> "The core of thematic comparative literature is that in your study of literature you make comparisons across cultures (Languages), comparison across time and comparison

between literate and oral traditions. All of the comparisons are guided by a theme." [5]

یعنی موضوعاتی تقابلی مطالعہ میں کسی بھی ادب کے مطالعہ میں تہذیبوں، زبانوں اور ادوار کے مابین موضوعات کی بناپر تقابل کیاجاتاہے۔

اس طرح موضوعاتی تقابلی مطالعہ دراصل تقابلی مطالعہ کی ہی تخصیص شدہ شکل ہے۔اس مطالعہ میں متن کے مخصوص عنوانات کی بنیادپر تقابل ہوتاہے جبکہ تقابلی مطالعہ میں مکمل متن کا تجزیہ ہوتاہے۔

موضوعاتی تقابلی مطالعہ کے اطلاقات

تقابلی مطالعہ ہماری روزمرّہ زندگی کا حصّہ ہے۔اس کااطلاق ہر میدان میں کیاجاسکتاہے جیسے سماجی، مذہبی، تہذیبی، معاشی، اخلاقی، سیاسی اور جغرافیائی بنیادوں پر تقابلی تجزیہ کیاجاسکتاہے۔مثال کے طورپر دو مذاہب کا تقابلی مطالعہ، ان میں خداکا تصور، اخلاقی تعلیمات، عورت کا مقام جیسے موضوعات کی بنیادپر کیاجاتا ہے۔اور یہ دیکھاجاتاہے کہ آیاان موضوعات میں یہ دومذاہب یکساں ہیں یاایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک دوسرے کے تضاد کی شکل میں سامنے آئے یاایک دوسرے کی اضافہ شدہ شکل ہیں۔

Reza Azarianکے مطابق:

"Comparative analysis is an old mode of research, widely used within many, if not all, fields of scientific inquiry. As a method strategy, comparison plays an important part in the most diverse branches of the humanities and the social sciences alike." [6]

اسی طرح شخصیات، ممالک، کتابوں اور زبانوں وغیرہ کے مابین مختلف موضوعات یاپیمانوں پر تقابل کیاجاتا ہے۔

موضوعاتی تقابلی مطالعہ کی ضرورت واہمیت

تقابلی مطالعہ خواہ دو سماجوں کے درمیان ہو، دو تہذیبوں کے درمیان ہو یا کتابوں اور مضامین کے ما بین ہو اس میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ اس تکنیک کے ذریعہ مواد کو سمجھ کر اس کے بہتر پہلو تلاش کئے جاتے ہیں۔اور اس کے فوائد کا ادراک کر کے اس کو وسیع پیمانے پر مختلف مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی ایک ملک کا تعلیمی نظام قابلِ تقلید ہے تو اسے سمجھنا اور دوسرے ملک میں اس طرز کا نظام لاگو کرنے کا لائحہ عمل بنانا اور وہاں اس نظام کو رائج کرنے کا منصوبہ تیار کرنا تقابلی مطالعہ کا مقصد ہے۔اسی طرح دو افکار، کتابوں یا زبانوں کے مابین تقابل سے اس میں موجود تمام خوبیوں کا ادراک و فہم حاصل ہوتا ہے اور اس کو مزید بہتر شکل میں مفادِ عامہ کی خاطر پیش کیا جا سکتا ہے۔

موضوعاتی تقابلی مطالعہ کے درج ذیل فوائد ہیں۔

1۔اس مطالعہ کے ذریعہ مواد یا متن کو منظم (Organize) کرنے میں مدد ملتی ہے۔

2۔ متن کی گہری توضیح (Rich Description) میں مددگار ہوتا ہے۔

3۔ متن کی معنوی (Semantic) اور تحتی (Latent) پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔

4۔ متن کو جامع (Concise) ، مربوط (Coherent) اور تکرار سے پاک (Non-repetitive) بنانے میں مددگار ہوتا ہے۔

5۔ متن کی صحت کے ساتھ ساتھ پیچیدگیوں (Intricacies) کو سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے۔

قرآن کے اہم موضوعات

قرآنِ حکیم کتابِ ہدایت کے ساتھ ساتھ مصدرِ معلومات، منبعِ علم اور جوہرِ حکم بھی ہے۔اس طرح یہ کتاب مرقعِ علم و ہدایت ہے۔اس کتاب کی شان یہ ہے کہ اس کا موضوع اور اس کے تفصیلی مباحث انتہائی سنجیدہ نوعیت کے ہونے کے باوجود پڑھتے وقت قاری پر سوز و گداز اور رقّت کی کیفیت طاری کر دیتے

ہیں۔اور ایک سنجیدہ قاری اس کی حلاوت اور مرعوبیت اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔قرآن جن پہلوؤں سے بحث کرتا ہے اس کا جامع تعارف نعیم صدیقی نے اس طرح پیش کیا:

"اس کتاب کا موضوع انسان ہے اور یہ انسان کی زندگی کے ہر پہلو سے بحث کرتی ہے۔اس میں زندگی کو ایک وحدت اور ایک کل مان کر گفتگو کی گئی ہے۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب ایک مخصوص طرز کی سوشیالوجی (سماجیات) کی کتاب ہے اور ایک مکمل سوشل سسٹم یا نظامِ اجتماعی ہمارے سامنے رکھتی ہے۔بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ قرآن عدلِ اجتماعی کا ایک جامع فارمولا ہے۔ایسی کتاب میں قدرتی طور پر ہر شعبہء زندگی اور ہر علم کے بارے میں بحث ہونی چاہئے، لیکن یہ کتاب ہماری مروجہ تقسیمِ علوم کے مطابق کسی خاص جُزوی علم کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اس میں تمام علوم پر حاوی ہو جانے والا اور تمام علوم کو چند اٹل بنیادی حقائق اور اصولوں کے ذریعہ منضبط اور ہم آہنگ کرنے والا علم پیش کیا گیا ہے، جسے اس کتاب نے اصطلاحاً "العلم" (The Knowledge) قرار دیا ہے۔یعنی وہ علمِ ہدایت جو انسانی زندگی کی مجموعی فلاح کے لئے ناگزیر بنیادی علم ہے۔وہ رہنما علم جو تمام علوم کو اور انسانی قافلہ ہائے افکار کو درستی پر قائم رکھتا اور انھیں بھٹکنے سے روکتا ہے۔" [7]

قرآن مجید کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

"جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پوری کائنات پر حاوی ہے۔وہ کائنات کی حقیقت، اس کے آغاز و انجام، اس کے نظم و آئین پر کلام کرتی ہے۔وہ بتاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق اور ناظم و مدبر کون ہے، کیا اس کی صفات ہیں، کیا اس کے اختیارات ہیں۔" [8]

مزید لکھتے ہیں:

"وہ صحیح راستے کی صرف نشاندہی کر کے نہیں رہ جاتی بلکہ اس راستے پر چلنے کے لئے ایک پورے نظامِ زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔جس میں عقائد، اخلاق، تزکیہء نفس، عبادات، معاشرت،

تہذیب، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت، قانون غرض حیاتِ انسانی کے ہر پہلو سے متعلق ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔" [9]

اس طرح قرآن بیک وقت کئی موضوعات سے تعارض کرتا ہے جیسے عقائدِ اسلام، توحید، رسالتِ محمد ﷺ، صحائفِ آسمانی، عباداتِ اسلام، تخلیقِ کائنات، حیاتِ دُنیا، معاشرت، اقتصادیات، احکامِ الٰہیہ، نظامِ اسلامی مملکت، اوصافِ دینِ اسلام، دعوتِ دین، غیر مسلمین، ابطالِ عقائدِ باطلہ، حیات بعد از موت، واقعاتِ حیات طیبہ رسول کریم ﷺ، قصص انبیار کرام علیہم السلام، مؤمنین و صالحین، قصص افراد و اقوامِ ماضی، قرآن میں جدید سائنسی علوم کا تصور وغیرہ۔ [10]

وسیع ترین موضوعات کی حامل اس کتاب کو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مضامینِ قرآن کو پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ علمِ احکام (اس کے تحت حلال و حرام، عبادات، معاملات، معاشرت و سیاست کی بحث آتی ہے)، علمِ مخاصمہ (اس علم کے مطابق قرآن میں چار گمراہ فرقوں یعنی یہودیوں، عیسائیوں، مشرکین اور منافقین سے بحث و مباحثہ کیا گیا)، علم تذکیر بآلاء اللہ (اس علم کے لحاظ سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی نشانیوں کا ذکر ہے)، علم تذکیر بایّامِ اللہ (اس علم کا تعلق تاریخی واقعات سے ہے)، علم تذکیر بالموت ومابعد الموت (اس علم کا تعلق موت اور آخرت کے احوال وواقعات سے ہے)۔ [11]

اس مقام پر اس حدیث کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا:

"قرآن پانچ قسم کی باتوں پر نازل ہوا ہے۔ حلال و حرام، محکم و تشابہ، امثال۔ تو تم حلال کو حلال جانو، حرام کو حرام سمجھو۔ محکم پر عمل کرو، تشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال سے عبرت حاصل کرو"۔[12]

اس طرح آیاتِ احکام، آیاتِ قصص، توحید، رسالت، آخرت کا بیان، آیاتِ امثال اور کائنات کی نشانیاں وغیرہ قرآن کے اہم موضوعات قرار دئے جا سکتے ہیں۔

میں نے اپنے مقالہ میں قرآن کے مذکورہ بالا موضوعات میں سے چار موضوعات کو منتخب کر کے ان کے مختلف تراجم کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

قرآن کے اردو تراجم کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت واہمیت

اُردو برصغیر ہندو پاک میں کثرت سے استعمال ہونے والی زبان ہے۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت قرآن کو سمجھنے کے لئے اردو تراجمِ قرآن پر ہی انحصار کرتی ہے اور ہر مترجم کا ترجمہ، اندازِ بیان، الفاظ کے انتخاب، مفہوم کی ترسیل اور علاقائی اثر کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔اس لئے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اب تک کے قرآنِ پاک کے ہونے والے تراجم کا جائزہ لیا جائے اور اہلِ علم کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جائے اور ان تراجم کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسی خصوصیات کی نشاندہی کی جائے جو آئندہ تراجم میں مزید بہتری لا سکیں۔

1۔ قرآن کا کوئی بھی ترجمہ خواہ کتنا ہی صحیح و معیاری کیوں نہ ہو قرآن کی تمام معنوی جہتوں کو ترجمہ میں پیش نہیں کر سکتا۔ ایک مترجم کو ایک لفظ کے جو معنی زیادہ مناسب لگتے ہیں وہ اسے ترجمے میں برتتا ہے. لہذا تقابلی مطالعہ کے ذریعہ ایک لفظ کے تمام ممکنہ معنوں تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے۔

2۔ قرآن کی خاصیت یہ ہے کہ اس کلام میں ہر زمانہ کے بدلتے رُجحانات اور بدلتی انسانی ضروریات کو بیان کرنے کی صلاحیت ہے جبکہ دوسری زبانوں میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ اسی لئے ترجمہ میں زمانے کے لحاظ سے الگ الگ الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں اور یہ ایک مسلسل چیلنج ہے کہ قرآن کے تراجم کے معیار کو بڑھایا جائے۔اس مقصد کے لئے بھی تقابلی مطالعہ سود مند ہے۔

3۔ ہر ترجمہ میں مترجم کے خیالات و فکر اور رجحانات کا اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا تقابل کے ذریعہ یہ دیکھنا بھی اہمیت کا حامل ہے کہ کونسا ترجمہ قرآنی متن سے زیادہ قریب ہے۔

4۔ قرآن کے تراجم کو فہمِ قرآن کا ذریعہ سمجھا جائے۔ نہ کہ کسی ایک ترجمہ کو حتمی سمجھ کر اسی ترجمہ کو باقی تمام تراجم پر فوقیت دی جائے۔ تقابلی مطالعہ سے اس رُجحان کو کم کیا جاسکتا ہے اور وسعتِ نظری پیدا کی جاسکتی ہے۔

قرآن کے ترجمہ کی ضرورت واہمیت مسلم ہے لیکن علماء اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کا ترجمہ بعینہ ترجمہ کے بجائے ترجمانی ہوتی ہے۔ یہ ترجمانی مترجم کی وسعتِ فہم و فکر پر مبنی ہوتی ہے۔ چونکہ ہر مترجم کی وسعتِ فہم و فکر منفرد ہوتی ہے اسی لئے ایک ہی متن کے مختلف تراجم وجود میں آتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تقابلی مطالعہ کے ذریعہ سے عام قاری میں یہ شعور بیدار کیا جائے کہ وہ قرآن کا ترجمہ پڑھ رہا ہے نہ کہ قرآن، اور ترجمہ کی وجہ سے مختلف مکاتبِ فکر کے افراد میں جو نظریاتی اختلاف یا غلط فہمیاں ہیں انھیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

تقابلی مطالعہ کی اسی اہمیت وضرورت کے پیشِ نظر میں نے اس موضوع کا انتخاب کیا ہے۔

قرآن مجید کے اردو تراجم کا موضوعاتی تقابلی مطالعہ: چند عملی پہلو

سب سے پہلے ان تراجم کے انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا جن کا مجھے تقابل کرنا تھا۔ اس کے لئے میں نے چار مشہور تفاسیر کا انتخاب کیا جو مختلف مکاتبِ فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔

1۔ کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن، مترجم مولانا احمد رضا خان بریلویؒ (تفسیر نعیم الدین مرادآبادیؒ)

2۔ احسن البیان، مترجم مولانا محمد جوناگڑھیؒ (تفسیر حافظ صلاح الدین یوسفؒ)

3۔ تفہیم القرآن مترجم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

4۔ معارف القرآن، مترجم شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (تفسیر مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

میں نے ان تراجم کا انتخاب اس لئے بھی کیا کہ یہ تمام معہ تفسیر ہیں۔ اگرچہ میرا کام تفاسیر کا تقابل نہیں ہے لیکن کسی مترجم کے ترجمہ میں اختلافی پہلو کی وجہ دریافت کرنے میں سب سے زیادہ مددگار ان کی تفسیر ہوتی ہے۔ احکامات کے موضوع میں ترجمہ کے بالمقابل تفسیر میں اختلافی پہلو زیادہ ملتے ہیں اس لحاظ سے بھی ترجمہ

کے ساتھ تفسیر درکار تھی۔اس لئے میں نے ان تراجم معہ تفاسیر کو منتخب کیا۔ لیکن میں نے تفسیری مباحث سے تقابل کو بوجھل ہونے نہیں دیا ہے، صرف اسی حد تک تفسیر سے استفادہ کیا جہاں مترجم کی فکر کا اثر ترجمہ پر ہوا ہو۔ایسے مقامات پر اس کی وجہ بیان کرنے کے لئے تفسیری حواشی کی طرف رجوع کیا۔

ان تراجم کے انتخاب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ تراجم برّصغیر میں بہت مقبول ہیں اور کثرت سے پڑھے جانے والے تراجم ہیں ۔اس طرح ان تراجم کے تقابل سے تمام ہی مترجمین کے ترجموں کے محاسن سامنے آتے ہیں اور بین مسلکی رواداری کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

عملی پہلو میں دوسرا مرحلہ موضوعات کے انتخاب کا تھا۔اس کے لئے میں نے قرآن کریم کے اہم موضوعات احکام القرآن کو "احکامات"، امثال القرآن کو "تمثیلات" کے عنوان سے اور قرآن میں مذکورہ فطری حقائق کو "آیاتِ انفس و آفاق" کے عنوان سے لیا ہے۔ اس کے علاوہ آخرت کا بیان بھی تحقیق کا ایک موضوع ہے۔اس طرح چار بڑے موضوعات کا تقابل مقالہ میں کیا گیا ہے۔ہر موضوع کے تحت ذیلی عناوین آتے ہیں۔ میں نے ان موضوعات کے تحت چند مثالیں قرآن پاک سے منتخب کیں پھر ان کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔

تیسرا عملی پہلو، تقابل کے طریقہ کار کا تعین ہے۔

مقالہ کا طریقہ کار عام تحقیقی روش سے ذرا مختلف ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے میں نے قرآنی موضوعات کا انتخاب کیا اور ہر موضوع سے متعلق چند مثالیں یا نمونے قرآن سے لئے اور قرآنی متن کے نیچے تمام منتخب تراجم نقل کئے پھر ان کا تقابل کیا۔ جس میں متنِ قرآنی کی بنیاد پر اختلافات کے گوشے تلاش کئے گئے۔اس طرح تمام تراجم بہ ایک نظر دیکھنے سے ظاہری اختلافات قاری کی نظر میں آجاتے ہیں۔البتہ تحقیقی مطالعہ میں ترجمہ کے محاسن اور کمزوریوں کی تفصیل آئی ہے۔ جن پیمانوں پر یہ تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا وہ درج ذیل ہیں:

- الفاظ واصطلاحات کے استعمال میں کونسے مترجم نے وسیع معنوں میں ترجمہ کیا۔
- مفہوم کی منتقلی میں کس حد تک کامیاب رہے۔
- ترجمہ میں سیاق وسباق کا لحاظ کس حد تک کیا گیا۔
- مترجم کی فکر کا ترجمہ پر کیا اثر ہوا۔
- موضوع کے اعتبار سے طرز بیان کی انفرادیت کو ترجمہ میں کہاں تک ملحوظ رکھا گیا۔

ان پہلوؤں میں سے جس مقام پر جو پہلو اختلافی پہلو کی حیثیت سے سامنے آیا اسی پر تقابلی جائزہ پیش کیا گیا۔ ہر موضوع کے تحت تمام پہلو لازماً زیر بحث نہیں رہے۔

اس مطالعہ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس مترجم نے قرآن کے کس موضوع کو بحسنِ خوبی ترجمہ میں منتقل کیا ہے۔ نیز اس مطالعہ میں ان تراجم کی منفرد خصوصیات کو اُجاگر کیا گیا ہے اور ایسے نکات کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے آئندہ تراجم میں مزید بہتری پیدا ہو سکے۔

یہاں اس امر کا اظہار ناگزیر ہے کہ مقالہ نگار کے دل میں اپنے منتخب کردہ تمام مترجمین کا یکساں احترام پایا جاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوئی کہ میں نے مقالہ میں مترجمین کے مکمل نام لکھنے سے اجتناب کیا ہے اور یہ اجتناب ناموں کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ لہٰذا، اسے مقالہ نگار کی بے ادبی یا سوء ظنی پر محمول نہ کیا جائے بلکہ تحقیقی روش کی مجبوری سمجھا جائے۔

قرآن مجید کے اُردو تراجم کے تقابلی مطالعات: ایک تاریخی جائزہ

قرآن کے اردو تراجم کے تقابلی مطالعہ کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ یہ ایک نئی تحقیقی روش ہے جس کے ابتدائی نقوش سن 1982ء میں سامنے آئے۔ یہ ڈاکٹر حمید شطاری کا پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ ہے۔ اپنے مقالہ کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کے ان تراجم کا اس انداز سے تنقیدی جائزہ لینے کی شاید یہ پہلی کوشش ہے اور ان خطوط پر آئندہ کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے [13]۔

اسی بناپر اس کام کو اُردو تراجم کا پہلا تقابلی مطالعہ مان کر اس کام کا مختصر جائزہ پیش ہے۔

1۔ "قرآن مجید کے اُردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ -1914ء تک"، پی۔ایچ۔ڈی مقالہ از ڈاکٹر سید حمید شطاری (ریڈر شعبہ ءاُردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد)۔ مطبوعہ 1982ء۔

اس مقالہ کو ادوار کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا۔ باب دوم سے تقابلی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں قدیم دکنی تراجم و تفاسیر 1115ھ مطابق 1703ء تک کے تراجم کا جائزہ لیا گیا۔اس میں چار نثری اور ایک منظوم ترجمہ پر بحث کی گئی ہے۔ باب سوم میں 1703 تا 1789ء تک کے تراجم، باب چہارم میں 1789ء تا 1858ء اور باب پنجم میں 1858ء تا 1914ء کے تراجم کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا۔

اس مقالہ میں مخطوطات اور مطبوعات کو شمار کیا جائے تو 60 تراجم و تفاسیر پر تنقیدی کام کیا گیا۔اس میں زیادہ تر چند خاص سورتوں کے ترجمے پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے ترجمہ کے آہنگ و اسلوب پر زیادہ توجہ دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> "زیرِ نظر تحقیقی کام کو 1914ء پر اس لئے ختم کیا گیا کہ اس کے بعد اردو نثر کے آہنگ و اسلوب میں ایسا کوئی تغیر نہیں آیا جس سے قرآن کے ترجمے کی زبان اور اسلوبِ بیان میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہو۔"

زیرِ نظر مقالے کے مطالعہ سے واضح ہو گا کہ مقالہ نگار کی ساری توجہ ترجمے کے الفاظ، جملوں میں ان کے دروبست اور جملوں کی بخوبی ترکیب پر خصوصیت کے ساتھ توجہ مرکوز رہی [14] ۔یہی وجہ ہے کہ مقالہ نگار نے الفاظ کے عربی قواعد پر تجزیہ کے دوران تفصیلی گفتگو کی ہے۔

اس مقالہ کو تقابلی مطالعہ کے تحت اس لئے شامل کیا کہ اس میں مقالہ نگار نے کئی مقامات پر دکنی تراجم کا دوسرے تراجم کے ساتھ تقابلی تجزیہ بھی کیا ہے۔ جس ترجمہ سے منتخب ترجمہ کا تقابل کیا گیا اس کی تخصیص نہیں کی گئی البتہ ایک ترجمہ کے مقابلہ میں دو یا تین معروف تراجم کو رکھ کر تجزیہ کیا گیا۔ان تراجم

میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمود حسنؒ وغیرہ کے ترجموں سے دکنی تراجم کا تقابل کیا گیا۔

2۔"اُردو تراجمِ قرآن کا تقابلی مطالعہ" از پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری، ادارہ تحقیقاتِ احمد رضا انٹرنیشنل، سنِ اشاعت مارچ 2007ء۔

یہ کتاب 64 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں انھوں نے 10 مترجمین سر سید احمد خان علی گڑھیؒ، مولوی عاشق الٰہی میرٹھیؒ، مولوی فتح محمد جالندھریؒ، ڈپٹی نذیر احمد دہلویؒ، مولوی محمود حسن دیوبندیؒ، مولوی مرزا وحید الزماںؒ، مولوی اشرف علی تھانویؒ، امام احمد رضا محدث بریلویؒ، ابوالکلام آزادؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تراجم کا تقابل کیا ہے۔

صاحبِ کتاب نے ہر مترجم کے ترجمہ سے ایک یا دو آیات کا انتخاب کیا اور اس کا تقابل مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کے ترجمہ سے کیا اور ہر تجزیہ میں مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کے ترجمہ کو دوسرے تراجم کے مقابلہ میں زیادہ مناسب اور قابلِ ترجیح قرار دیا۔ تجزیہ میں زیادہ تر انھوں نے اُردو الفاظ کے استعمال اور ان کی ترکیب پر گفتگو کی ہے۔مثال کے طور پر بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے ترجمہ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> "سوائے امام احمد رضا کے، بقیہ 8 مترجمین نے اسم "اللہ" سے ترجمہ نہ کیا بلکہ سب نے لفظ 'شروع' سے ترجمہ کیا اور اسم 'اللہ' کو مضاف کے بعد رکھا ہے جبکہ اردو قواعد کے مطابق اسم 'اللہ' جو مضاف الیہ ہے، پہلے آنا چاہئے [15]۔

اس لحاظ سے امام احمد رضاؒ کا ترجمہ بالکل درست قرار پاتا ہے۔

3۔"قرآن مجید کے آٹھ منتخب اُردو تراجم کا تقابلی مطالعہ" از ڈاکٹر محمد شکیل اوج، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، سنِ اشاعت اپریل 2010ء۔

یہ کتاب 264 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں انھوں نے آٹھ مترجمین مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ

مودودیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ، مولانا ابو منصورؒ کے تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔

صاحبِ کتاب نے تقابل کے لئے پارہ عم کے سورتوں کا انتخاب کیا۔ لکھتے ہیں:

"پارہ عم کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ پارہ بالعموم مسلمانوں کو یاد ہوتا ہے اور اس کی سورتیں اور آیتیں بالعموم نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں اور یاد کی ہوئی آیت یا سورت کا سمجھنا نہ صرف آسان ہوتا ہے بلکہ بہت دلچسپ بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا تقابل کے لئے زیادہ مناسب یہ معلوم ہوا کہ پارہ عم کو بنیاد بنایا جائے۔" [16]

انھوں نے بلحاظِ معنویت، بلحاظِ لغویت اور بلحاظِ ادبیت و متفرقات کے عناوین سے الگ الگ ابواب میں تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کیا۔ مقالہ نگار نے اپنے تجزیہ میں بالکل غیر جانبداری کے ساتھ تمام تراجم کے تقابلی نتائج بیان کئے ہیں۔

4۔ "حضرت شیخ الہندؒ اور فاضل بریلویؒ کے ترجمہء قرآن کا تقابلی جائزہ" از مولانا قاری عبد الرشیدؒ، استاذِ حدیث و تفسیر جامعہء مدنیہ، لاہور۔ تاریخِ طباعت جولائی 2012ء۔

یہ کتاب 168 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں دو مترجمین کے اُردو ترجمہ قرآن کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے: شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (1852ء۔1920ء) اور احمد رضا خان بریلویؒ (1856ء۔1921ء)۔ یہ تقابلی جائزہ سورۃ الفاتحہ (مکمل) اور سورۃ البقرہ کی ابتدائی 37 آیات پر مشتمل ہے۔ اس میں الفاظ کے استعمال پر لسانی بحث کی گئی۔ اس جائزہ میں مولانا محمود حسنؒ کے ترجمہ کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔

5۔ ان کتب کے علاوہ نومبر 2014ء سے ماہنامہ الشریعہ میں "اردو تراجم قرآن پر ایک نظر: مولانا امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں" کے عنوان سے ڈاکٹر محی الدین غازی کے سلسلہ وار مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ جن کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ ان مضامین میں عموماً تفہیم القرآن اور تدبّرِ قرآن کی غلطیوں کو زیر بحث لایا گیا جن کی مولانا امانت اللہ اصلاحی نے مذکورہ ترجموں پر نظر ثانی کے دوران نشاندہی

فرمائی تھی۔ یہ مضامین نہایت باریک بینی سے عربی قواعد واسالیب بیان کی ترجمہ میں منتقلی پر گہرا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ان مضامین کے لکھنے کا مقصد قرآن کا ترجمہ اجتماعی مساعی سے کئے جانے پر زور دینا ہے۔

اب تک قرآن کے تراجم کے تقابل پر مذکورہ بالا کاوشوں کا پتہ چلا ہے۔ عین ممکن ہے اس کے علاوہ بھی ہندو پاک میں کچھ کام ہوا ہو، جہاں تک پہنچنا میرے لئے بوجوہ ممکن نہ تھا۔

حوالہ جات

[1] Linda Hantrais, "Comparative Research Methods", Social Research Update, University of Surrey (U.K), Issue 13, 1995.

[2] Syed Aftab Hassan Bukhari,"What is Comparative Study", Social Science Research Network, 2011(SSRN 1962328)

[3] Syed Aftab Hassan Bukhari,"What is Comparative Study", Social Science Research Network, 2011(SSRN 1962328)

[4] Dr. Aude Bicquelet, "Thematic Analysis", National Centre for Research Methods, U.K, 2014.

[5] Ron Scollon Suzie Scollon, "How to Teach Thematic Comparative Literature: A Curriculum Note for Secondary Teachers", The Axe Handle Academy, University of Alaska, 1986.

[6] Reza Azarian, "Potentials and Limitations of Comparative Method in Social Science", International Journal of Humanities and Social Science, Stockholm University,Vol.1, No.4, April 2011.

[7] نعیم صدیقی، قرآن کی امتیازی خصوصیات، مشمولہ سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر، ادارہ معارف اسلام (کراچی)، جلد 13، شمارہ 5، نومبر 1969ء، ص 273

[8] سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ، اعجاز القرآن، مشمولہ سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر، ادارہ معارف اسلام (کراچی)، جلد 13، شمارہ 5، نومبر 1969ء، ص 280

[9] ایضاً، ص 281

[10] انجینئر عبدالحکیم ملک، منشورِ قرآن، اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن، پاکستان، 2007ء

[11] شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر مولانا محمد رفیق چودھری، الفوزالکبیر، مکتبہ قرآنیات (لاہور)، ص14

[12] محمد فاروق خان، کلامِ نبوّت، حصہ اول، بحوالہ مصابیح۔ بیہقی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (دہلی)، 2007ء، ص242

[13] ڈاکٹر سید حمید شطاری، قرآن مجید کے اُردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ 1914ء تک، نظام اردو ٹرسٹ (حیدرآباد)، 1982ء، ص9

[14] ایضاً

[15] پروفیسر ڈاکٹر مجیداللہ قادری، اُردو تراجمِ قرآن کا تقابلی مطالعہ، ادارہ تحقیقاتِ احمد رضا انٹرنیشنل، مارچ 2007ء، ص59

[16] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلیکیشنز، 2010ء، ص9

باب دوم

قرآن اور ترجمہ

قرآن کا تعارف

قرآن اللہ کا کلام ہے اور تمام جہان والوں کے لئے کتابِ ہدایت ہے۔ قرآن کا بہترین تعارف قرآن ہی سے ہو سکتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے اس قرآن کے آغاز ہی میں فرمایا:

ذَلِكَ الْكِتَابُ لاَ رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (البقرہ:2)

یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے متّقیوں کے لئے۔

یعنی اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہے،

تَنزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ(السجدہ:2)

اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ اللہ ربُّ العالمین کی طرف سے ہے۔

اس کے علاوہ قرآن میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان کی صداقت میں، جو احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں، ان سے انسانیت کی فلاح اور نجات وابستہ ہونے میں اور جو عقائد (توحید، رسالت اور معاد کے بارے میں) بیان کئے گئے ہیں، ان کے برحق ہونے میں کوئی شک نہیں [1]۔ اس کتاب کو لے کر اترنے والی ہستی حضرت جبریلؑ آسمانوں میں بزرگ اور امین ہیں اور جس پر نازل ہوا وہ زمین میں صادق اور امین ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا:

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ (الشّعراء:192تا194)

بے شک وشبہ یہ (قرآن) ربُّ العالمین کا نازل فرمایا ہوا ہے، اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ آپ کے دل پر اُترا ہے کہ آپ آگاہ کر دینے والوں میں سے ہو جائیں۔

اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ یوں فرمایا کہ یہ کتاب منزل مِن اللہ ہے نہ کہ حضرت محمد ﷺ کی تصنیف۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝ (السجدہ: 3)

کیا یہ کہتے ہیں کہ اُس نے گھڑ لیا ہے، نہیں نہیں، بلکہ یہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے۔ تاکہ آپ انہیں ڈرائیں۔ جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔

ان آیات کی روشنی میں قرآن کی جامع تعریف اس طرح ہو سکتی ہے۔

"یہ ایسا کلام معجز ہے جو اللہ کی طرف سے محمد ﷺ کے قلب مبارک پر بذریعہ وحی، جبرئیلؑ کی وساطت سے نازل کیا گیا۔ جو صحیفوں میں کتابت اور سینوں میں حفظ دونوں طرح سے محفوظ ہے"۔

قرآنِ کریم کے نام

بعض علماء نے قرآن کریم کے 90 سے زائد نام ذکر کئے ہیں [2]۔ در حقیقت یہ تعداد قرآن حکیم کے صفاتی نام جیسے 'شفاء'، 'نور'، 'بشیر'، 'نذیر' اور تشبیہ واستعارے کے طور پر آنے والے نام جیسے 'حبلُ اللہ' (اللہ کی رسّی) اور 'العُروۃالوُثقیٰ' (مضبوط سہارا) وغیرہ کو بھی قرآن کا نام قرار دینے کی وجہ سے ہے۔

دراصل قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے آٹھ ناموں (القرآن، الکتاب، الفرقان، الذکر، التنزیل، الحق، احسن الحدیث، برھان) کا ذکر اسم علم کے طور پر کیا ہے [3]۔

ان سب ناموں میں 'القرآن' اور 'الکتاب' زیادہ مشہور ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يِهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ۝ (بنی اسرائیل: 9)

ایک اور مقام پر فرمایا:

ذَلِكَ الْكِتَابُ لاَ رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (البقرہ:2)

اور سورۃ الواقعہ میں ان دونوں اسماء کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے۔

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ (الواقعہ:77،78)

القرآن

قرآن قَرَاءَ سے مشتق ہے جس کے معنی پڑھنے کے ہے۔ڈاکٹر صبحی صالح نے علامہ اللّحیانی کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن بروزن غفران مصدر مہموز ہے۔اس کا مادہ قَرَاءَ (پڑھا) ہے۔یہ نام اس لئے دیا گیا کہ یہ پڑھا جاتا ہے گویا بمعنی اسم مفعول ہے [4]۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ (القیامہ:17،18)

اس کو جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔جب ہم اُس کو پڑھ چکیں تو اس کے بعد آپ پڑھیں۔

بعض علماء کے نزدیک لفظ 'قرآن' میں اسم آلہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے جو دوام اور تسلسل پر دلالت کرتا ہے۔اس لئے قرآن سے مراد وہ کتاب ہو گی جو بار بار اور تسلسل سے پڑھی جائے [5]۔

الکتاب

الکتاب کَتَبَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہے لکھنا۔یہ نام قرآن کو اس لئے دیا گیا کہ اللہ کی وحی کو سطور میں جمع کیا گیا۔قرآن کو کتاب کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حد درجہ کی بلاغت کے ساتھ اقسام علوم، قصص اور اخبار کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔اور کتاب لغت میں جمع (فراہم آوروں) کو کہتے ہیں [6]۔

ڈاکٹر صبحی صالح لکھتے ہیں:

"قرآن کریم کے یہ دونوں نام آرامی الاصل ہیں۔آرامی زبان میں کتابت کے معنی نقش کرنا اور حروف کا لکھنا ہے جبکہ قراءت آرامی زبان میں تلاوت کو کہتے ہیں" [7]۔

یہ نام اس بات کی طرف دلالت کرتا ہے کہ یہ ایسا کلام نہیں جو صرف پڑھا، سنا اور دلوں میں محفوظ ہوتا ہے بلکہ یہ 'لکھا ہوا' سطور میں درج بھی ہے۔ سورۃ الواقعہ میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں ناموں کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے۔

یہ دونوں نام اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ وحی محمدی ﷺ کی حفاظت کتابت اور قراءت دونوں طریقوں سے ہو گی۔ اور نزولِ قرآن سے آج تک کے تمام ادوار میں اس کلامِ الٰہی کو حفظ کے ذریعہ سینوں میں اور کتابت کے ذریعہ صحیفوں میں محفوظ کیا گیا اور قیامت تک اس کی حفاظت ہوتی رہے گی، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اس کے نازل کرنے والے نے لیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر:9)

رہا یہ ذکر، تو اِس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اِس کے نگہبان ہیں۔

قرآن کی زبان

قرآن اپنے عہد کی مستند ترین زبان، عربی میں نازل ہوا۔ یہ بات متعدد مقامات پر قرآن میں بیان کی گئی ہے۔

حٰمٓ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (الزخرف:1تا3)

حٰم، قسم ہے اِس واضح کتاب کی، ہم نے اِس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے کہ تم سمجھ لو۔

ایک اور مقام پر فرمایا،

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (یوسف:2)

ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم (اہل عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔

سورۃ الرّعد میں ارشاد ہے:

وَكَذَلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءهُم بَعْدَ مَا جَاءكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّهِ مِن وَلِيٍّ وَلاَ وَاقٍ (الرعد:37)

اِسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے۔اب اگر تم نے اِس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔

چونکہ قرآن کی اوّل مخاطب قومِ حجاز تھی جن کی زبان عربی تھی اس لیے فرمایا گیا کہ اس کو تمہاری زبان میں نازل کیا گیا تاکہ تم سمجھ سکو۔اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ ہر قوم میں جب بھی ہدایت آئی اللہ نے ان ہی کی زبان میں نازل فرمائی۔جیسا کہ ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلاَّ بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّهُ مَن يَشَاء وَيَهْدِي مَن يَشَاء وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۝(ابراہیم:4)

ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے،اُس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے،وہ بالادست اور حکیم ہے۔

اسی طرح قرآن کا نزول چونکہ عرب قوم میں ہوا اس لئے الٰہی ہدایت کا عربی زبان میں نازل ہونا بے حد مناسب و ضروری تھا۔اگر یہ قرآن عربی میں نازل نہ ہوتا تب یہ سوال پیدا ہوتا کہ یہ کیوں غیر زبان میں نازل کیا گیا۔اس ذہنی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یوں بیان فرمایا:

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاء وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى أُوْلَئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ۝ (سورہ حٰم السجدہ:44)

اگر ہم اِس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے "کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی "اِن سے کہو یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا

ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے اُن کا حال تو ایسا ہے جیسے اُن کو دور سے پکارا جا رہا ہو۔

قرآن کی زبان کو عربی مبین کہا گیا یعنی ایسی صاف، سلیس اور واضح زبان میں جس میں کوئی اینچ پیچ، ٹیڑھ یا کجی نہیں ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝(الشعراء:195)

صاف صاف عربی زبان میں۔

قُرآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝(الزّمر:28)

قرآن ہے عربی میں جس میں کوئی کجی نہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ پرہیزگاری اختیار کر لیں۔

اس مقام پر یہ بات غور طلب ہے کہ عربی مبین سے مراد کون سی عربی ہے۔ اس لئے کہ عربی زبان ایک ہے لیکن اس کی کئی ساری بولیاں (dialects) ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب میں بھی متعدد بولیاں تھیں۔ تلفظ اور لہجے مختلف تھے۔ بعض الفاظ کسی خاص علاقے میں مستعمل تھے اور دوسرے علاقے کے لوگ ان الفاظ کو نہیں جانتے تھے۔ خود نزول قرآن کے زمانے میں نجد کے لوگوں کی زبان حجاز کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی وضاحت ایک حدیث میں ملتی ہے کہ نجد سے کچھ لوگ آئے اور وہ حضور ﷺ سے گفتگو کر رہے تھے جو بڑی مشکل سے سمجھ میں آ رہی تھی [8]۔

لیکن عربی کی فصیح زبان ایک ہے۔ یہ دراصل حجاز کے بدّؤں کی زبان تھی۔ پورا قرآن حکیم حجاز میں نازل ہوا۔ اور قرآن مجید کی زبان جس میں یہ نازل ہوا وہ حجاز کے علاقے کے بادیہ نشینوں کی عربی ہے۔ جس میں فصاحت و بلاغت نقطہ عروج پر ہے اور اس کا لوہا مانا گیا ہے [9]۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ مقدّمہ تدبرِ قرآن میں لکھتے ہیں:

"قرآن مجید جس زبان میں اترا ہے وہ نہ تو حریری و متنبی کی زبان ہے، نہ مصر و شام کے اخبارات و رسائل کی، بلکہ وہ اس ٹکسالی زبان میں ہے جو امرءالقیس، عمرو بن کلثوم، زہیر اور لبید جیسے شعراء اور قیس بن ساعدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کے ہاں ملتی ہے" [10]۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بادیہ نشینوں کی زبان قریش تک کیسے منتقل ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے نزول سے قبل عربوں کے پاس اگر کوئی چیز باعث افتخار تھی تو ان کی زبان تھی۔ اور اس زبان و ادب کے ارتقاء میں عرب کے بازاروں اور میلوں کا بڑا اہم رول تھا۔ عرب کے میلوں میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجار مشہور میلے تھے۔ ان میں سے سوق عکاظ یکم ذیقعدہ سے بیس ذیقعدہ تک مکّہ اور طائف کے قریب لگتا تھا۔ ان میلوں میں تجارت، جنگ و صلح کے قوانین سے متعلق اہم مشوروں کے علاوہ خطبوں اور اشعار کے ذریعہ اپنے اپنے قبیلوں کے اوصاف بیان کئے جاتے تھے۔ بازار عکاظ میں عرب کے بڑے بڑے شعراء اور خطیب حصّہ لیتے تھے۔ ہر سال ان میں مقابلہ ہوتا اور جس کا قصیدہ سب پر بازی لے جاتا اسے کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا جاتا۔ یہ قصائد "سبعہ معلّقات" سے موسوم تھے۔

قریش چونکہ کعبہ کے متولّی تھے، سوقِ عکّاظ میں بھی اپنے اختیارات رکھتے تھے۔ وہ مختلف اطراف سے آئے ہوئے اشعار و خطبات کو بڑی توجہ سے سنتے تھے اور ان کے بہترین الفاظ کو اپنا لیتے تھے یہاں تک کہ ان کی اپنی زبان سالہا سال کی ارتقائی منازل طئے کر کے فصاحت و بلاغت کے درجہ کمال تک پہنچ گئی۔ اور قریش کی اِسی ٹکسالی زبان میں قرآن مجید کا نزول ہوا جیسا کہ ارشاد ہے:

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (الدخان:58)

ہم نے اسے تمہاری زبان میں نازل کر کے آسان بنایا تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔

ہر قبیلے کو قریش کی دانائی اور لہجے کی برتری کا اعتراف تھا۔ اس بنا پر قریش کا لہجہ اتنا قوی ہو گیا کہ تقریباً پورے عرب کا لہجہ بن گیا۔ اور جب قرآنِ کریم قریش کے لہجہ کے مطابق نازل ہوا تو اسے فصیح عربی لہجہ کا درجہ حاصل ہو گیا[11]۔

لہٰذا، قرآن کی عربی کا مکمل فہم عرب کے شعراء واد باء کے کلام کے فہم سے ہو سکتا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

"جو شخص قرآن کی زبان کے ایجاز واعجاز کا اندازہ کرنا چاہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دور جاہلیت کے شعراء واد باء کے کلام کے محاسن و معایب کے سمجھنے کا ذوق پیدا کرے۔ اس کے بغیر کوئی شخص نہ تو یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن عربی زبان کے محاسن کا کیسا کامل نمونہ ہے اور نہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اندر وہ کیا سحر ہے جس نے تمام فصیحوں اور بلیغوں کو ہمیشہ کے لئے عاجز و درماندہ کر دیا"[12]۔

روایات میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قرآن کے نامانوس الفاظ یا غریب لغات کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے جاہلیت کے اشعار کی طرف مراجعت کرتے تھے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

"الشعر دیوان العرب۔ اشعار اہلِ عرب کے علوم و زبان کا مجموعہ ہیں۔ اس واسطے اگر ہم کو قرآن کے کسی لفظ کا مفہوم ٹھیک نہ معلوم ہو سکے تو اس لحاظ سے کہ خداوند کریم نے اس کو اہلِ عرب کی زبان میں نازل فرمایا ہے ہم اس زبان کے دیوان کی طرف رجوع کریں گے اور اس میں قرآن کے لفظ کا حل تلاش کریں گے۔" [13]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"تم اپنے دیوان کی طرف مراجعت کرو، گمراہ نہیں ہوگے۔ لوگوں نے کہا، ہمارا دیوان کیا ہے؟ فرمایا جاہلیت کی شاعری، اس میں تمہاری کتاب کی تفسیر ہے اور تمہارے کلام کے معانی بھی"[14]۔

قرآن کی زبان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ عربی زبان کا معیار پچھلے چودہ سو صدیوں سے بالکل نہیں بدلا جبکہ زبانیں وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ معدوم ہو جاتی ہیں۔ عموماً تین سو سال کے عرصہ

میں زبان بدل جاتی ہے۔ لیکن چودہ سو سال کا عرصہ گذرنے کے باوجود قرآن کی عربی کا کوئی لفظ متروک نہیں ہوا بلکہ آج بھی معیاری اور فصیح و بلیغ عربی کے لئے قرآن کی طرف ہی رجوع کیا جاتا ہے۔

قرآن کا اسلوب

اسلوب دراصل اس طریقہ تعبیر کا نام ہے جسے ایک مصنف یا متکلم اظہار مافی ضمیر کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یعنی اسلوب کا تعلق طرزِ ادا سے ہے، جس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی بات کو کن الفاظ، کس ترکیب، ترتیب اور فقروں کے ذریعہ ادا کیا گیا ہے۔

علامہ ابنِ خلدون کی رائے میں اسلوب دراصل وہ ذہنی تصویر ہے جو ذہن و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہے اور مطالعہ و استفادہ سے ذوق پر اثرانداز ہو جاتی ہے۔ اسی ذہنی تصویر کی نمائندگی وہ لفظی مظاہر کرتے ہیں جن کو ہم اسلوب کہتے ہیں۔ اسلوب دراصل تحریر کے طریقے، انشاءپردازی کے سلیقے، تعبیر و تشریح کے لیے الفاظ کے انتخاب اور ترتیب یا نظم کی قسموں کا نام ہے۔ اور یہی ادبی اسلوب کی تعریف ہے [15]۔

کلام کے اظہار کی لیے ہر زبان میں الگ الگ اصول اور طریقے ہیں اور اس کے حُسن کو جانچنے کے لئے الگ الگ معیارات ہیں۔ لیکن اس بات پر ہر زبان کے اہلِ علم متفق ہیں کہ مضمون کو اس خوبی سے ادا کیا جائے کہ وہ مکمل طور پر سامع یا قاری تک پہنچ جائے۔ مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور قلب اور دماغ پر اپنا تاثر چھوڑے۔

علمائے ادب نے وضاحتِ اسلوب، قوتِ تاثیر اور جمال و رعنائی کو اسلوب کی لازمی خصوصیات بتایا ہے۔ اور یہ تمام خصوصیات قرآنی اسلوب میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

عربوں کے معروف اسالیب

نزولِ قرآن سے قبل عربوں میں چار قسم کے اسالیب مروج تھے۔

1۔ قصیدہ

2۔ خطبہ

3۔کہانت

4۔رسائل(مکتوب)

ان چار اسالیب کے علاوہ وہ نظم یا نثر کے کوئی اور اسلوب سے واقف نہ تھے۔

زمانہ ء جاہلیت میں عرب مستقبل کے حالات کی جانکاری کے لئے کاہنوں سے رجوع کرتے تھے۔ان کے اقوال (کہانت) چھوٹے چھوٹے، بے معنی اور مبہم جملوں پر مشتمل ہوتے تھے جو وہ علمِ غیب کے اظہار کے لئے بولا کرتے تھے۔اور اس میں وہ سجع کا اہتمام والتزام کرتے تھے۔کاہنوں کا کلام "سجع الکہان" کہلاتا تھا۔ ان کے اقوال سجع سے بوجھل اور معنی کے لحاظ سے بالکل کھوکھلے ہوا کرتے تھے[16]۔کاہنوں نے جس طرزِ نثری کو رواج دیا اس میں سجع کے معنی صرف مترادفات کے بے تکے استعمال نظر آتے ہیں۔ جن میں معنی اور مضامین کے فقدان کے ساتھ بے حد تکلف اور آورد سے کام لیا گیا[17]۔

عربوں میں فصیح اللّسان اور بلیغ البیان خطباء تھے جو قیصر روم و کسریٰ، فارس کے درباروں میں عربوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ان کی خطابت چھوٹے چھوٹے متوازن جملوں اور موزوں الفاظ پر مشتمل ہوتی تھی۔ معنوں کے درمیان کوئی ربط نہ ہوتا تھا۔خطبوں میں مسجع اور مقفی جملے ملتے ہیں۔ خطبے کے مضامین میں قومی افتخار، آباواجداد کی مدح وستائش، قبیلے کے لوگوں کی شجاعت کے بیان وغیرہ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔

قرآن کے متعدد سورتوں میں خطبہ کا اسلوب ملتا ہے۔اس طرز کی سورتوں کا آغاز يَا أَيُّهَا الَّذِينَ یا حمد و تسبیح کے الفاظ سے ہوتا ہے۔اول الذکر کی مثال سورۃ النساء، سورۃ المائدہ، سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر وغیرہ اور دوسری قسم کی مثال سورۃ الانعام، سورۃ الفرقان، سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الملک ہیں [18]۔

قصیدہ عربوں میں زبان دانی کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔اس میں تین ارکان تشبیب، گریز اور خاتمہ ہوتے تھے۔ تشبیب کا آغاز وہ عجیب و غریب مقامات اور ہولناک واقعات سے کرتے تھے۔ کبھی مناظر

فطرت سے بھی تشبیب کرتے۔ قصیدے میں قومی و شخصی امتیاز، قبائلی افتخار سے لے کر عورت کے حسن وادا اور جام و شراب سب کا ذکر ہوتا تھا[19]۔

عرب قصائد میں ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف انتقال جتنا لطیف اور غیر محسوس ہوتا تھا اتنا ہی کلام کی خوبی میں اضافہ ہوتا تھا۔ خاص طور پر جب شاعر تشبیب سے گریز کا مضمون باندھتا تھا تو اس میں جتنی لطافت اور گہرائی ہوتی تھی اتنا ہی قصیدے کی خوبی میں اضافہ سمجھا جاتا تھا[20]۔ مثال کے طور پر امرءالقیس (جو سبعہ معلقات کے شعراء میں شمار ہے) اپنے معلقہ میں پہلے محبوبہ کا غائبانہ تعارف کراتا ہے۔ اس سے اپنے عشق و محبت کی داستان بیان کرتا ہے اور اس کی خوبصورتی و نزاکت پر سر دُھنتا ہے۔ پھر کلام کا پہلو بدل کر اسے براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے یوں حالِ دل سناتا ہے:

الارب خصم فیک الوی رددتہ　　نصیح علی تعذالہ غیر موتل

(تمہاری محبت کے تئیں جھگڑا کرنے والے کتنے ہی رقیبوں کو میں نے دھتکار دیا جو اپنی توبیخ میں خیر خواہ معلوم ہوتے تھے اور مجھے باز رکھنے میں کسی قسم کی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے) [21]۔

قرآن مجید میں بھی اس طرح کا اسلوب ملتا ہے جہاں پر مخاطب یا صیغوں کی تبدیلی انتہائی لطافت اور غیر محسوس طریقے سے ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثال سورۃ الفاتحہ ہے جس میں آغاز میں غائبانہ انداز میں اللہ تعالیٰ کی حمد و تقدیس ہے پھر اللہ کی رحمت اور قدرت کا ذکر ہے۔ پھر بندے کی جانب سے خدا سے یوں خطاب ہے، ایاک نعبد و ایاک نستعین۔

اس پیہم تبدیلی کو علماءِ بلاغت نے 'التفات' سے تعبیر کیا ہے۔ التفات کا اسلوب قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ کبھی مخاطب اہل ایمان ہوتے ہیں تو کبھی اہل کفر، کبھی مخلصین تو کبھی منافقین، کبھی خطاب کا انداز اور صیغہ بار بار بدلتا ہے۔

اہلِ عرب قصیدہ کی تشبیب میں عجیب وغریب مقامات اور خوفناک واقعات کا ذکر کرتے تھے۔اس طرح کا ملتا جلتا اسلوب قرآن کی ان سورتوں میں ملتا ہے جہاں آخرت کے مضامین بیان ہوئے۔ مثال کے طور پر سورۃ الانفطار، سورۃ النازعات، سورۃ القارعہ وغیرہ۔

قرآن کے بعض سورتوں میں مکتوب (خطوط) کا اسلوب ملتا ہے۔مکتوب کے تین اجزائے ترکیبی ہیں: مکتوب نگار، مکتوب الیہ اور مضمونِ مکتوب۔ حروف مقطّعات کی حامل اکثر سورتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان حروف کے بعد سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مکتوب (سورہ) خدا کی طرف سے ہے اور مرسل الیہ محمد ﷺ ہیں جو اس کے رسول ہیں۔اس کے بعد مضمون کو بیان کیا گیا۔ مثال کے طور پر:

الم ۞اللَّهُ لا إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ۞نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ۞ (آل عمران: 1تا3)

حٰم ۞ تَنزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۞ (المؤمن: 1،2)

يس ۞ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ۞إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ۞(یٰس: 1تا3)

قرآنی اسلوب کی انفرادیت

قرآن کا اسلوب ان تمام اسالیب سے منفرد ہے۔اگرچہ ان تمام اسالیب کی جھلک قرآن میں ملتی ہے لیکن کسی بھی اسلوب کی مکمل پابندی نہیں ہے۔ان تمام اسالیب سے زیادہ بااثر اور فصیح و بلیغ اسلوب اختیار کیا گیا۔اس میں شعر اور خطبہ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔یہ نہ تو اس شعر کی طرح ہے اور نہ اس نثر کی طرح جو اس دور کے فصحاء اور شعراء اپنے کلام میں اکثر کیا کرتے تھے۔

عربی شاعری میں قافیہ اور بحر کی پابندی ضروری ہے جبکہ آیات قرآنی میں قوافی تو ملتے ہیں لیکن شعر کی طرح لازمی جزو نہیں ہے اور آیتوں کا طول بھی مختلف ہوتا ہے جبکہ اشعار میں مصرعوں کا برابر ہونا (بحر کی پابندی) لازمی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ العصر کی تینوں آیتیں ہم قافیہ ہیں لیکن طول میں مختلف ہیں۔

قرآن کا اسلوب متوازن صوتی آہنگ اپنے اندر رکھتا ہے جو فطرت انسانی سے زیادہ قریب ہے۔ حلاوت و شیرینی اور اثر انگیز کلام کے لئے انسانوں کے وضع کردہ اصول ہر علاقے میں الگ الگ ہوتے ہیں۔ جو چیز قدرِ مشترک ہے وہ سر سری وزن اور آہنگ ہے اور قرآن میں یہی چیز ملتی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق:

"اللہ نے اپنے کلام کو شعر و موسیقی کے ان اصول و قواعد پر نہیں رکھا جو مختلف ملکوں میں مختلف ہے بلکہ ان کے درمیان مشترک وزن اور آہنگ کو اختیار کیا گیا۔ پھر اسے خوش اسلوبی بلکہ معجزانہ طور پر کام میں لایا"[22]۔

دراصل قرآن کریم نے شعر و نثر کی دونوں خوبیوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے اور فنی نثر کی ایک منفرد قسم سے متعارف کروایا جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق:

"قرآن وزن و قافیہ کی پابندی سے آزاد ہے اور اس طرح اس میں تعبیر و بیان کی آزادی کا وصف پوری طرح موجود ہے جس سے شعر عاری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن نے شعری اوصاف میں سے داخلی موسیقی کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ آیات کے فواصل میں پائے جانے والے متقارب فی الوزن الفاظ نے قرآن کو اوزان سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اسی طرح قافیہ نما الفاظ کے ہوتے ہوئے اصل قافیہ کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اس اعتبار سے قرآن نظم و نثر دونوں کے اوصاف کا حامل و جامع ہے" [23]۔

قرآن فنی نثر کی ایک منفرد قسم ہے جس کی نظیر و مثل کہیں نہیں ملتی۔ اس کے الفاظ میں صوتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ علامہ ابن خلدون بیان کرتے ہیں کہ قرآن پاک اگرچہ نثر ہے، مگر نہ تو نثر مرسل ہے اور نہ مسجع۔ بلکہ اس کی آیتوں میں فاصلہ ہے اور وہ ایسے مقطعوں پر ختم ہوتی ہے کہ ذوق ان پر کلام کے ختم ہونے

کی شہادت دیتا ہے۔ پھر ہر مقطع کے بعد دوسری آیت کا آغاز ہو جاتا ہے اور اسی طرح اختتام کو پہنچ جاتا ہے اور اس میں کسی حرف کا التزام نہیں کیا جاتا کہ وہ سجع یا قافیہ بن جائے [24]۔

قرآن کا اسلوب معجزہ کی حد کو پہنچا ہوا ہے۔ یہ نثر ہونے کے باوجود ایسا معجزاتی آہنگ اپنے اندر رکھتا ہے کہ شعر کی حلاوت اور لطافت سے زیادہ شیریں ہے۔ قرآن کے اس نادر اور اچھوتے اسلوب بیان کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح بیان کیا:

"اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب قرآن میں وزن اور قافیے کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے تو پھر اس میں اسی وزن اور قافیے کو کیوں اختیار نہیں کیا گیا، جس کا رواج عربوں کی شاعری میں موجود تھا اور جو قرآن کے وزن اور قافیے سے زیادہ پر لطف ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لطف و دلکشی ایک اضافی (Relative) چیز ہے جو ہر قوم کے مزاج اور احوال سے مختلف ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ بحث فضول ہے کہ کیا چیز پر لطف ہے اور کیا نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر قرآن میں بھی عربی شاعری کے مروجہ وزن اور قافیے کو اختیار کیا جاتا تو اہل عرب اسے اپنی شاعری جیسی چیز سمجھ کر اس کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوتے۔ پھر جیسا کہ اعلیٰ درجے کے شاعروں اور ادیبوں کا طریقہ ہے وہ اپنے ہم عصر شعراء اور ادباء پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے نظم یا نثر میں اپنا نیا اسلوب ایجاد کرتے ہیں اور پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی اس طرح کی غزل کہہ کر دکھائے یا اس طرح کی تحریر و نگارش لکھے۔ عام لوگ بھی ان کی انفرادیت کو محسوس کرتے ہیں اور ان کی عظمت کو مانتے ہیں۔ اگر عظیم شعراء و ادباء بھی پرانا گھسا پٹا اسلوب اختیا کریں تو سوائے ایک آدھ محقق و ناقد کے کوئی ان کو اہمیت نہ دے"[25]۔

حقیقت یہ ہے کہ عربوں کو معلوم تھا کہ حضرت محمد ﷺ اُمی ہیں اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ جب آپ ﷺ کی طرف سے قرآن کی شکل میں وزن اور قافیے کا ایک نیا اسلوب سامنے آیا تو یہ آپ کا معجزہ قرار پایا۔ گویا آپ کی نبوت و رسالت کو سچا ثابت کرنے والی دلیل سامنے آگئی [26]۔

قرآنی اسلوب کی انفرادیت کا ثبوت اِس واقعہ سے ملتا ہے۔ایک دفعہ مشہور قریشی سردار، ولید بن مغیرہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا۔ آپؐ نے حسبِ دستور اُسے بھی قرآن پڑھ کر سنایا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کلام الٰہی کے اثر سے اس کے دل کی سختی مات کھا چکی ہے۔ خاموشی سے گھر واپس چلا آیا۔ یہ خبر ابو جہل تک پہنچی، تو گھبرایا ہوا اس کے پاس آیا اور کہا: "چچا جان! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں (اپنی پوزیشن صاف کر دیجئے) اور کچھ ایسے الفاظ فرما دیجئے جن کو سُن کر آپ کی قوم کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ آپ اس شخص کے دعوے کی صداقت تسلیم نہیں کرتے"۔ ولید نے جواب دیا "آخر کیا کہوں؟ بخدا شعر ہو یا رجز، قصائد ہو یا جنی اشعار، غرض عربی کلام کی ایک ایک صنف کو میں تم سب سے بہتر جانتا ہوں۔ خدا کی قسم یہ شخص جو کلام پیش کر رہا ہے، وہ ان میں سے کسی چیز کے بھی مشابہ نہیں۔ بخدا اس کے کلام میں ایک عجیب حلاوت اور ایک خاص طرح کا حسن ہے۔ اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں اور اس کی جڑیں بڑی شاداب ہیں، یقیناً، وہ ہر کلام سے بلند ہے اور کوئی دوسرا کلام اُسے نیچا نہیں دکھا سکتا، کوئی شک نہیں کہ وہ ہر اس چیز کو توڑ کر رکھ دے گا جو اس کے نیچے آجائے گی" [27]۔

قرآن کا اعجاز

لفظ معجزہ 'عجز' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی عاجز کرنے کے ہے۔ اعجاز کے اصطلاحی معنی وہ خارق عادت (غیر معمولی) امر ہے جو اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کی نبوّت کی صداقت کے لئے دنیا پر ظاہر کیا ہو۔ ایسی خارق عادت نشانی کو معجزہ کہتے ہیں۔ امام سیوطیؒ کے مطابق:

> "معجزہ ایسے خارق عادت امر کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تحدی بھی کی گئی ہو اور وہ معارضہ سے سالم رہے" [28]۔

لہٰذا، معجزہ میں تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

1۔ وہ امر جو ظاہر ہوا ہو، خارق عادت ہو یعنی وہ عام انسانوں کے بس میں نہ ہو یا ان کی سکت سے باہر ہو۔

خَرَقَ، پھٹ جانے کو کہتے ہیں۔ وہ طبعی قوانین (Physical Laws) جن کے مطابق یہ دنیا چل رہی ہے اگر کسی موقع پر وہ ٹوٹ جائیں اور ان کے ٹوٹ جانے سے اللہ کی کوئی مشیتِ خصوصی ظاہر ہو تو اسے 'خرقِ عادت' کہتے ہیں [29]۔

2۔ وہ کسی پیغمبر کے دعوی نبوت کی صداقت کے طور پر بھیجا گیا ہو۔ اور اس میں تحدّی (Challenge) بھی ہو۔

3۔ وہ انسانوں پر ایسا واضح کر دیا جائے کہ انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

معجزہ کی اس تعریف کی روشنی میں دیکھیں تو اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ نبی ﷺ کا اصل معجزہ، قرآن ہے۔

نبی ﷺ کو خارق عادت کے طور پر بہت سے معجزات عطا کئے گئے (جیسے شقِّ قمر، ستونِ حنانہ وغیرہ) لیکن آپ ﷺ نے ایسے خارقِ عادت معجزات کو دعویٰ کے ساتھ نہیں دکھایا اور نہ ہی اس پر کسی کو چیلنج کیا بلکہ قرآن کو ہی نبوت کی دلیل یا معجزہ کے طور پر پیش کیا۔ جیسا کہ اس حدیث سے وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

> "ہر ایک نبی کو کچھ معجزے عطا کئے گئے جن کے مطابق لوگ ان پر ایمان لائے۔ میرا معجزہ جو مجھے عطا ہوا وہ وحی (قرآن) ہے جسے خدا نے میری طرف بھیجا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز میرے پیرو تمام نبیوں سے زیادہ ہوں گے" [30]۔

معجزہ کی دو قسمیں ہیں۔ حِسّی اور عقلی۔ حِسّی معجزہ قابلِ مشاہدہ ہوتا ہے یعنی جسے دیکھا یا محسوس کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر حضرت صالحؑ کی اونٹنی، حضرت موسیٰؑ کا عصاء وغیرہ۔ جبکہ عقلی معجزہ کا تعلق فہم وذکاوت سے ہے۔ محمد ﷺ کو عقلی معجزہ یعنی قرآن عطا کیا گیا جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات قیامت تک کے لیے ہیں اور حِسّی معجزات کا اثر وقتی ہوتا ہے جبکہ عقلی معجزہ پر جتنا غور وتدبر کیا جائے اتنا ہی اثر انگیزی میں اضافہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت رہی ہے کہ انبیاء کو ان کے قوم کے مذاق کے مطابق معجزے عطا کئے گئے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کے دور میں جادو کا زور تھا تو اسی مناسبت سے جادو کو عاجز کر دینے والا معجزہ دیا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے دور میں طبِ یونانی کا شہرہ تھا تو انھیں ایسے معجزات عطا کئے گئے جس کے آگے طبِ یونانی کا عجز لاحق ہو گیا۔ اسی طرح نبی ﷺ ایسی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے جن کا ذوق قدرتِ کلام تھا۔ زبان دانی اور فصاحت و بلاغت ان کا میدان تھا۔ اسی بنا پر آپ ﷺ کو قرآن بطورِ معجزہ عطا کیا گیا جس کے آگے عرب عاجز آ گئے۔

قرآن کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟ اس پر اہل علم و ادب نے مختلف موقف اختیار کیے۔ کسی کی نظر اس کی لسانی خصوصیات پر مرکوز ہوئی تو کسی نے گوناگوں علمی پہلوؤں کو وجہ اعجاز بتایا۔

بلحاظِ مخاطب، حضور ﷺ کی بعثت دو طرح کے لوگوں پر ہوئی۔ ایک وہ جو آپ ﷺ کے راست مخاطب تھے یعنی قومِ عرب۔ دوسرے وہ لوگ جو آپ ﷺ کے بعد قیامت تک پیدا ہونے والے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

(الجمعہ: 2،3)

وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود اُنہی میں سے اُٹھایا، جو اُنہیں اس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اِس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ اور (اس رسول کی بعثت) اُن دوسرے لوگوں کے لئے بھی ہے جو ابھی اُن سے نہیں ملے ہیں۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔

اس طرح سے قرآن کے مخاطب دو طرح کے لوگ ہیں اور ان دو مخاطبین کے لحاظ سے دو مختلف طرح کا اعجاز قرآن میں پایا جاتا ہے۔ پہلی نوعیت کا اعجاز اس کی لسانی خوبیاں ہیں جو نبی ﷺ کے اوّلین

مخاطبین سے متعلق ہیں۔اور دوسری نوعیت کا اعجاز قرآن کے علمی پہلوؤں سے متعلق ہے، جتنا لوگ اس پر غور و خوض کرتے جائیں گے، نئی نئی چیزیں سامنے آتی جائیں گی اور یہ قرآن کے اعجاز کا وہ پہلو ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا۔

اہلِ عرب کو جو چیز متاثر کر سکتی تھی وہ کلام اللہ کے لفظی معنی، اس کی فصاحت و بلاغت، اس کے اسلوب کی بلندی، اس کے صنائع و بدائع اور اس کے نظم کا کمال ہے۔ وہ لوگ قانون، فلسفہ و ریاضی سے واقف نہیں تھے۔ زباندانی اور فصاحت و بلاغت ہی ان کا میدان تھا۔ وہ اپنے آپ کو فصیح اللسان اور اپنے علاوہ ہر ایک کو عجم یعنی گونگا سمجھتے تھے گویا ان کو اپنی زبان دانی پر اتنا ناز تھا کہ ان کی نظر میں ساری دنیا گونگی تھی [31]۔

یہاں یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ معجزہ جس میدان کا ہوتا ہے اسے اسی میدان کے افراد بخوبی پہچان سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر موسیٰؑ کے معجزات کی حقیقت جادوگروں پر منکشف ہوئی اور انھوں نے پہچان لیا کہ یہ جادو نہیں کچھ اور ہے اور حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے، جبکہ فرعون ایمان نہیں لایا بلکہ اس نے حضرت موسیٰؑ کو بھی جادوگر ہی سمجھا۔

اسی طرح قرآن کے معجزہ کو محسوس کرنے کی اصل صلاحیت عرب کے فصحاء و شعراء میں تھی اور قرآن کا کلامِ معجز ہونے کا احساس بھی انھیں کو زیادہ ہوا۔ لہٰذا جب عربوں نے قرآن کو سُنا تو دوست اور دشمن سب اس کی فصاحت و بلاغت اور نادر اسلوبِ بیان سے بے حد متاثر ہوئے۔ قرآن کے سامنے عرب کے فصحاء و بلغاء کے سپر ڈالنے کے واقعات تاریخ میں بہت ملتے ہیں۔ جن میں حضرت لبید رضی اللہ عنہ کا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

حضرت لبید رضی اللہ عنہ 'سبعہ معلقہ' کے آخری شاعر تھے۔ ان کے کلام کو بطورِ اعزاز 'مذہبات' بھی کہا جاتا تھا یعنی 'سونے سے لکھے جانے کے قابل'۔ عرب کی روایت کے مطابق جس کا قصیدہ سب پر بازی لے جاتا اس کی عظمت کے اعتراف میں تمام شعراء اُسے سجدہ کرتے تھے۔ لبید رضی اللہ عنہ کی عظمت کا

اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ سوقِ عکاظ میں ان کے ایک شعر پر تمام شعراء نے انہیں سجدہ کیا۔ گویا وہ 'مسجودالشعراء' تھے۔ان کے اشعار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ کہا کرتے تھے'اکتبوہ علیٰ الحناجر و لو بالخناجر 'یعنی اُسے سانس کی نالیوں پر لکھوا گرچہ خنجروں کی نوک سے لکھنا پڑے۔ایسے بلند پایہ شاعر نے جب قرآن سُنا تو ایمان لے آئے اور ایمان لانے کے بعد شعر کہنا چھوڑ دیا۔ان کے ترکِ شعر پر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ان سے پوچھا گیا کہ اَب آپ شعر نہیں کہتے ؟۔انھوں نے جواب دیا"اَ بَعدَا لقُرآن "یعنی 'کیا قرآن کے بعد بھی اس کی گنجائش ہے ؟'۔ گویا زبانیں بند ہو گئیں اور ملک الشعراء نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ایسا شاعر جس کے آگے سارے عرب کے شعراء جھک گئے وہ قرآن کے آگے سرنگوں ہو گیا۔اور اس بات کا اعتراف کیا کہ نزولِ قرآن کے بعد اب کسی کو کچھ کہنے کا موقع باقی نہ رہا، کوئی اب اپنی فصاحت و بلاغت کا سکہ نہیں جما سکتا [32]۔

قرآن کی اثر انگیزی کا اعتراف شعراء کے علاوہ ہر خاص و عام کو تھا۔اس کی غیر معمولی قوّتِ تاثیر سے متاثر ہو کر کبھی وہ قرآن کو شعر کہتے تو کبھی سحر سے تعبیر کرتے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ شعر و کہانت سے مبرّاء ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب قرآن نازل ہوا تو عرب حیران رہ گئے کہ اسے کس صنف میں داخل کیا جائے۔ محض اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر اسے اللہ کا کلام ماننے سے انکار کرتے اور کہتے تھے کہ اسے آپ ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے۔اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ ثابت کر دیں کہ یہ 'منزِل مِن اللہ' نہیں بلکہ محمد ﷺ کا قول ہے۔

قرآن کا چیلنج

قرآن کے کلامِ معجز ہونے کے ثبوت میں صرف یہ ایک بات کافی ہے کہ جب عربوں نے قرآن کو اللہ کا کلام ماننے سے انکار کر دیا تب اللہ نے انھیں تحدّی دی کہ اگر یہ کام اتنا آسان ہے کہ اسے ایک ایسا شخص جس کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ اُمی ہے، گھڑ سکتا ہے تو تم اس کے مقابل میں بڑے بڑے فصحاء اور بلغاء کو بلا لو اور چاہو تو تمام جِنوں اور انسانوں سے مدد لے لو اور اس طرح کا کلام بنا لے آؤ۔

أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ ۝ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ۝ (الطّور:33،34)

کیاان کا کہناہے کہ یہ محمد ﷺ نے خود گھڑ لیاہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں۔ پھر چاہئے کہ وہ اسی طرح کا کلام پیش کریں اگر وہ سچے ہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ یہ کام تمام انسان و جِن مل کر بھی نہیں کر سکیں گے۔

قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن يَأْتُواْ بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لاَ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ۝ (الاسریٰ:88)

اگر تمام انسان و جِن ملکر اس قرآن جیسا کلام پیش کرنا چاہیں تو اس جیسا پیش نہیں کر سکیں گے۔ خواہ وہ ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کیوں نہ کریں۔

اس اعلان کے بعد اُن آتش بیان خطیبوں اور شعلہ نوا شاعروں کی محفل میں سنّاٹا چھا گیا۔ اور کوئی اس چیلنج کو قبول کرنے آگے نہیں بڑھا۔ چیلنج کو ایک عرصہ تک دہرایا گیا۔

پھر سورۃ یونس میں فرمایا گیا کہ اگر پورے قرآن کی نظیر نہیں لا سکتے ہو تو دس سورتیں ہی بنالاؤ۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُواْ بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُواْ مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ (ھود:13)

کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود گھڑ کر لے آیا ہے۔ (اے نبی ﷺ) ان سے کہئے تم بھی دس سورتیں بنالاؤ ایسی ہی گھڑی ہوئی۔ اور بلالو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔

یہ چیلنج بھی ایک عرصے تک قائم رہا مگر اس ان کی طرف سے مکمل خاموشی رہی۔ تب اللہ نے دس سے کم کر کے ایک سورہ کا چیلنج دیا۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُواْ بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُواْ مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ (یونس:38)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو، "اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سُورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بُلا سکتے ہو مدد کے لیے بُلا لو"۔

یہ چیلنج مکہ میں چار مرتبہ دہرایا گیا۔ لیکن عجز کی خاموشی رہی۔ پھر مدینہ میں اس کو دہرایا اور کہا گیا کہ یہ وہ کلام ہے جس پر گھڑے جانے کی تہمت تو کیا شک کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُواْ بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُواْ شُهَدَاءكُم مِّن دُونِ اللّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ وَلَن تَفْعَلُواْ فَاتَّقُواْ النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ۝(البقرہ:23،24)

اگر تم لوگوں کو شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسی ایک سورہ تم بھی بنا لے آو۔ اور اللہ کے سوا جس جس کو چاہو مدد کے لیے بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو، اور تم ہر گز ایسا نہ کر سکو گے، تو بچو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ یہ منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اس پر بھی سکوت طاری رہا۔ کوئی بھی اس کلام کے مقابلے میں چند جملے بنا کر نہ لا سکا۔ اگر یہ کام ان کے بس میں ہوتا تو وہ ضرور کر گزرتے۔ کیونکہ عرب بہت غیور، ضدّی اور جھگڑالو قوم تھی۔ وہ آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہ تھے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے: 'بلکہ وہ تو جھگڑالو قوم ہیں'[33]۔

سوچنے کی بات ہے کہ جس قوم کی کیفیت بقولِ علامہ جُرجانیؒ یہ ہو کہ اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ دنیا کے آخری سرے پر کوئی شخص اپنی فصاحت و بلاغت پر غیر معمولی گھمنڈ رکھتا ہے تو وہ اس پر تنقید کرنے اور اپنے اشعار میں اس پر چوٹیں کَسنے سے باز نہ رہ سکتی تھی، اس بات کا کیسے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کے ان مکرّر اعلانات کے بعد بھی چُپکی بیٹھی رہے، اور اسے دم مارنے کی جراءت نہ ہو؟ اس بات کی کوئی تاویل اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ فصاحت و بلاغت کے سورما قرآن کریم کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ چکے تھے[34]۔

قرآن کے جن جن پہلوؤں کو اعجاز کا حامل بتایا گیا ان میں سے چند یہ ہیں:

پیشن گوئیاں، جو حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر میں کفار کی شکست، "عنقریب یہ لوگ شکست کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں گے" [35]، اہلِ ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح، "اہلِ روم قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے" [36] وغیرہ۔

دلوں کے مخفی حالات کا اِنکشاف، جیسے منافقین کے دلوں میں پرورش پانے والے خیالات کا بروقت انکشاف، "یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے، حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے" [37]۔

گذشتہ اقوام کے حالات کا بیان، ان کا بیان اس انداز میں کیا گیا گویا آپ ﷺ نے بہ چشم خود دیکھا ہو۔ جیسے واقعہ یوسف علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام و فرعون کا مکالمہ، اصحابِ کہف کا واقعہ وغیرہ۔

یہ تمام پہلو اپنی جگہ اہم ہیں اور ان کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن اہلِ عرب جو قرآن کے اولین مخاطب ہیں ان کو متاثر کرنے والی اصل شئے اس کی لسانی خوبیاں ہیں۔ جس وقت قرآن نازل ہوا اس وقت کے اعتبار سے اعجازِ قرآن کا نمایاں اور اہم پہلو اس کی ادبیت، فصاحت و بلاغت، الفاظ کا انتخاب، اس کی بندشیں اور ترکیبیں، اس کی مٹھاس اور صوتی آہنگ ہے۔ کیوں کہ عرب علوم و فنون سے واقف نہ تھے۔ ان کے پاس زبان اور اس کی فصاحت و بلاغت ہی اصل شئے تھی۔ ان کا ذوق قدرتِ کلام تھا۔ اپنے آگے باقی سب کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت کو ہی اس کے اعجاز کی اہم وجہ مانا گیا ہے۔ لہٰذا، ہم اِسی پہلو کا خصوصیت سے تذکرہ کریں گے۔

فصاحت و بلاغت

فصاحت کے اصل معنی ظاہر ہونے کے ہیں۔ عرب کہتے ہیں اَفصَحَ الصُّبحُ جس کے معنی ہیں 'صبح ظاہر ہو گئی'۔ اس طرح فصیح کلام سے مراد وہ کلام ہے جو معنوں کے اعتبار سے واضح، الفاظ کے زاویہ ء نگاہ سے سہل اور ترکیب کے اعتبار سے عیوب سے خالی ہو۔

بلاغت کے لفظی معنی پہنچنے کے ہیں۔ عرب کہتے ہیں بَلَغَ فُلان مُرادَہُ یعنی فلاں اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ اس طرح بلاغت سے مراد کلام کی وہ خاصیت ہے جو سامع کے کانوں سے ہوتے ہوئے دل و دماغ پر اثر چھوڑے۔ کسی کلام کی بلاغت سے مراد الفاظ کی عمومی بندش سے جو مفہوم نکلتا ہے وہ اس طرح نکلے کہ بالکل حقیقت حال کے مطابق ہو۔ یعنی عظیم و جلیل معنی و مطالب کو ایسی فصیح اور صحیح عبارت میں ادا کرنا کہ اس سے نفسِ انسانی پر گہرا اثر پڑے۔ اس میں کلام کا اپنے موقع و محل کے اعتبار سے مناسب ہونا بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر صالحہ لکھتی ہیں:

"بلاغت کا تعلق معنی سے کم اور حسنِ الفاظ، جمالِ بندش اور خوبیِ ادا سے زیادہ ہے۔ دراصل بلاغتِ قرآن سے بھی قرآن کا معجزہ ہونا ثابت ہے" [38]۔

اکبر الٰہ بادی نے فصاحت و بلاغت کو ایک شعر کے ذریعہ بڑی سادگی سے سمجھا دیا:

سمجھ میں صاف آجائے فصاحت اس کو کہتے ہیں

اثر ہو سُننے والے پر بلاغت اس کو کہتے ہیں۔ [39]

قرآن مجید بہت فصیح بھی ہے اور بلیغ بھی۔ اور قرآن کے معجزہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ اس کی فصاحت و بلاغت ہی مانی جاتی ہے۔

امام فخر الدینؒ کے مطابق:

"قرآن کے اعجاز کی وجہ اس کی فصاحت، اسلوبِ بیان کی غرابت اور اس کا تمام عیوبِ کلام سے محفوظ ہونا ہے" [40]۔

قرآن میں فصاحت و بلاغت کے استمرار کو بھی اس کی اعجازی خصوصیت میں شمار کیا گیا ہے، یہ وہ واحد کتاب ہے جو شروع سے آخر تک اپنے معیار پر قائم ہے جبکہ دنیا کے بڑے سے بڑے ادیب و شاعر کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ اپنے کلام میں ہر معنی و مفہوم کے بیان کے لیے فصیح الفاظ سے نہ اترے، ہر انسانی کلام میں بعض بلند تو بعض پست جملے ضرور ملتے ہیں۔ حازم اپنی کتاب منہاج البلاغہ میں بیان کرتے ہیں:

"قرآن میں وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس میں ہر طرح پر اور ہر مقام میں یکساں طور پر بلاغت کا استمرار ہے۔ کہیں بھی اس کا سلسلہ ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ اور یہ بات کسی بشر کی قدرت میں نہیں اور کلامِ عرب یا ان کی زبان میں گفتگو کرنے والوں کے کلام میں اول سے آخر تک ہر جگہ یکساں فصاحت و بلاغت نہیں پائی جاتی۔ یہاں تک کہ اعلیٰ درجہ کے کلام میں بھی بہت کم حصہ ایسا ملتا ہے جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مکمل ہو ورنہ آگے چل کر جا بجا انسان کا فتور عقل عارض ہو جاتا اور کلام کی رونق و خوبی کو قطع کر ڈالتا ہے۔ بایں وجہ تمام کلام میں فصاحت کا استمرار نہیں رہتا بلکہ جزءًا اور چند متفرق ٹکڑوں میں اس کا وجود ہوتا ہے اور باقی عبارت درجہ فصاحت سے گری ہوئی ملتی ہے"[41]۔

علمائے ادب کسی کلام کے فصاحت و بلاغت کے ضمن میں اس بات پر متفق ہیں کہ کلام واضح ہو، غیر مانوس الفاظ سے پاک ہو، کسی قسم کا ابہام اور پیچیدگی نہ ہو۔ اس میں ایسی تاثیر ہو کہ مقابل یا سامع کے دل کو متاثر کر سکے۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت، حروف و اصوات اور الفاظ کی سطح سے لے کر ان کی ترکیب و ترتیب، ربط و ارتباط اور داخلی نظم سب میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

قرآن جس زمانے میں نازل ہوا اس میں فصاحت و بلاغت کی انتہا اس بات کو سمجھا جاتا تھا کہ انتہائی نپے تلے الفاظ میں بات پوری شان کے ساتھ واضح ہو جائے، اور کوئی بے مصرف یا اضافی لفظ تو کیا حرف بھی کلام میں نہ آئے۔

قرآن میں عربی کے ہزاروں الفاظ میں سے صرف چند سو الفاظ کے استعمال سے معنی و مفاہیم کے سمندر کا احاطہ کیا گیا۔اس کے بے شمار مترادف الفاظ میں سے صرف انھیں الفاظ کا انتخاب کیا گیا جو معنی کی ترسیل کے لیے موزوں ترین اور صورت حال کی صحیح رہنمائی کرنے والے ہوں۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بقول:

"چودہ سو برس گزرے کے بعد بھی آج تک یہ کتاب اپنی زبان کے ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جس کے برابر تو درکنار، جس کے قریب بھی عربی زبان کی کوئی کتاب اپنی ادبی قدر و قیمت میں نہیں پہنچتی۔یہی نہیں، بلکہ یہ کتاب عربی زبان کو اس طرح پکڑ کر بیٹھ گئی ہے کہ 14 صدیاں گزر جانے پر بھی اِس زبان کا معیارِ فصاحت وہی ہے جو اس کتاب نے قائم کر دیا تھا، حالانکہ اتنی مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو اتنی طویل مدت تک املا، انشاء، محاورے، قواعدِ زبان اور استعمالِ الفاظ میں ایک ہی شان پر باقی رہ گئی ہو۔لیکن یہ صرف قرآن کی طاقت ہے جس نے عربی زبان کو اپنے مقام سے ہلنے نہ دیا۔اُس کا ایک لفظ بھی آج تک متروک نہیں ہوا ہے۔اُس کا ہر محاورہ آج تک عربی ادب میں مستعمل ہے۔اُس کا ادب آج بھی عربی کا معیاری ادب ہے،اور تقریر و تحریر میں آج بھی فصیح زبان وہی مانی جاتی ہے جو 1400 برس پہلے قرآن میں استعمال ہوئی تھی۔کیا دنیا کی کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف اس شان کی ہے؟"[42]۔

مولانا حنیف ندوی نے قرآنی الفاظ کی درجہ ذیل خصوصیات کا ذکر کیا۔

1۔قرآنِ حکیم نے اظہارِ مطلب کے لئے جن الفاظ کو چُنا ہے دو خوبیاں ان میں نمایاں ہیں۔ایک یہ کہ وہ ذخیرہ الفاظ ایسا ہے جس میں دلالت و تعبیر کے علاوہ زندگی، بقاء اور مقابلہ کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس ارتقا کے باوجود جو جدید عربی میں الفاظ، ترکیب اور نحو کے میدانوں میں رونما ہوا ہے قرآنِ حکیم کا کوئی لفظ متروک یا فرسودہ قرار نہیں پایا۔

2۔قرآنی الفاظ نغمگی وصوت کے اعتبار سے عمدہ آہنگ اور نکھار لئے ہوئے ہے[43]۔

فصاحت وبلاغت سے متعلق تین علوم

علامہ عبد القاہر جُرجانیؒ نے علمِ بلاغت کے تین اقسام بیان کئے: علم البیان، علم المعانی اور علم البدیع۔علم البیان میں تشبیہ واستعارہ،اس کے ارکان،اقسام اوراس کے اغراض سے بحث کی جاتی ہے۔علم البیان کو ایک ہی معنی کی ادائیگی میں تنوّع اور اختلاف پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔کبھی تشبیہ واستعارہ کے ذریعہ، کبھی مجازی کلام کے ذریعہ اور بعض خاص حالات میں کنایہ سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔

تشبیہ

اس کے لغوی معنی مشابہت، تمثیل اور کسی چیز کو دوسری چیز کے مانند قرار دینا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا (الجمعہ:5)

جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا انھوں نے اس کا بار نہ اُٹھایا۔ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

اس آیت میں علم آنے کے باوجود اس پر عمل نہ کرنے والوں کو گدھوں سے تشبیہ دی گئی۔

استعارہ

استعارہ یہ ہے کہ کسی شخص یا شئے کی خصوصیت کو لے کر اس کا اطلاق کسی دوسرے شخص یا شئے پر کیا جائے۔مثال کے طور پر،

قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ أَكُن بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا (مریم:4)

اس نے کہا اے پروردگار، میری ہڈیاں تک گُھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اُٹھا ہے۔

یہاں پر سر کو بُڑھاپے سے بھڑکنے سے تشبیہ دے کر یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح بھڑکتی آگ کسی شئے کو پوری طرح اپنی لپٹ سے متاثر کرکے چھوڑتی ہے اسی طرح بڑھاپے کی وجہ سے سر کے بھڑکنے سے مراد ہے سارے بال سفید ہوگئے اور جوانی کے آثار بالکل نہ رہے۔

کنایہ

اس میں چھپے ہوئے انداز میں موصوف کی بعض صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ(الزخرف:18)

کیاوہ جسکی پرورش زیوروں میں کی جاتی ہے اور بحث وحجّت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح نہیں کر سکتی۔

یہاں پر "وہ جس کی پرورش زیوروں میں کی جاتی ہے" سے مراد لڑکیاں ہیں۔ یہاں ان کا نام لئے بغیر ان کا ذکر کنایۃً کیا گیا ہے۔

علم المعانی، وہ علم ہے جس میں کسی عبارت سے حقیقی معنی کے علاوہ قرائن اور سیاق وسباق سے جو اور معانی، مفہوم مستنبط ہوتے ہیں ان کی تشریح کی جاتی ہے۔

الَر كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ(ابراھیم:1)

یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ۔

اس آیت میں روشنی اور تاریکی سے کیا مراد ہے اس کی تشریح ووضاحت علم معانی کے تحت آتی ہے۔

علم البدیع، ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ و معانی کو انوکھے اور اچھوتے رنگوں سے لفظی اور لغوی حسن وجمال کے ذریعہ رنگا جاتا ہے۔ اس کا تعلق لفظی و معنوی محاسن سے ہے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ-(الروم:55)

جب قیامت کی گھڑی آئے گی تو مجرمین قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم صرف ایک گھنٹہ دنیا میں رہے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں لفظ 'ساعۃ' قابل غور ہے۔ دو مقامات پر الگ الگ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(ماخذ: البلاغۃ الواضحۃ)

نظمِ قرآن

قاضی ابو بکرؒ کے مطابق، قرآن کا اصل اعجاز اس کے نظم میں پوشیدہ ہے۔ اس کے اسلوب میں بدائع کا معارضہ پیش کرنے سے عرب عاجز ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں:

"اعجازِ قرآن کی وجہ وہ نظم وتالیف ہے جو اس میں پائی جاتی ہے اور وہ کلامِ عرب کے تمام معمولی اور مستعمل وجوہ نظم سے بالکل جداگانہ ہے۔ نظمِ قرآن اہلِ عرب کے اندازِ خطابات سے کوئی مشابہت ہی نہیں رکھتا اور اسی وجہ سے اہلِ عرب اس کا معارضہ نہ کر سکے۔ اگر کوئی چاہے کہ اہلِ عرب نے اپنے شعر میں جس قدر بدیع کے اصناف برتے ہیں ان کے ذریعہ اعجازِ قرآن کی معرفت حاصل کرے تو یہ بات کسی طرح ممکن نہیں۔ اس لئے کہ وہ بدائع خارق عادت امور نہیں ہیں بلکہ علم تدریب اور ان کے ساتھ تصنع کرنے سے ان کا ادراک کر لینا ممکن ہے۔ مثلاً، شعر کہنے، خطاب بیان کرنے، رسائل لکھنے کی مشق اور بلاغت میں کمال پیدا کرنے سے صنائع اور بدائع حاصل ہو سکتی ہے اور اُن صنائع وبدائع یا ایک طریقہ مقرر ہے جس پر لوگ چلتے ہیں مگر نظمِ قرآن کا مرتبہ بے مثل ہے اور اس کا کوئی نمونہ بجز اسی کے پایا نہیں جاتا اس لئے باتفاق قرآن کا مثل واقع ہونا غیر صحیح امر ہے۔ اور ہم اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ قرآن کے بعض حصہ میں اعجاز نہایت ظاہر اور واضح ہے اور بعض دوسرے حصہ میں بے حد دقیق اور غامض (مخفی)" [44]۔

ابن عطیہؒ کے مطابق:

"وہ صحیح بات جس کو جمہور اور اعلیٰ درجہ کے زباندان علماء قرآن کے اعجاز کی وجہ قرار دیتے ہیں یہ ہے کہ قرآن اپنے نظمِ عبارت، صحتِ معانی اور پے در پے الفاظ کی فصاحت کے باعث معجز ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ خداوند کریم کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے اور ایسے ہی تمام کلام پر بھی۔ لہٰذا جس وقت کوئی ایک لفظ قرآن کا مرتب ہوا اسی وقت خدا تعالیٰ نے اپنے احاطہ کے ذریعہ سے معلوم فرمالیا

کہ کون سا لفظ پہلے لفظ کے بعد آنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک معنی کے بعد دوسرے معنی کی تبیین کر سکتا ہے۔ پھر اس طرح اولِ قرآن سے آخر تک اس کی ترتیب ہوئی ہے [45]۔

قرآن مجید کے اندر حیرت انگیز تاثیر پائی جاتی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کے ایک ایک جملے نے کئی انسانوں کی زندگیاں تبدیل کر دی۔ قرآن کی تاثیرِ قلب اس کے اعجاز کا ایک اہم پہلو ہے یعنی قرآن کی آیات دل کو جا کر لگتی ہیں بشرط یہ کہ پڑھنے والے کے اندر تعصّب، ضد اور ہٹ دھرمی نہ ہو اور اسے زبان سے اتنی واقفیت ہو کہ براہِ راست قرآن اس کے دل پہ اثر کر سکے۔

قرآن کے اعجاز اور بلاغت کے علوم کا تذکرہ اس مقام پر اس لئے کیا گیا کہ ان کا ترجمہ سے گہرا تعلق ہے۔ علاوہ ازیں، ان علوم کے تعارف سے قرآن کے ترجمہ کی مشکلات سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

ترجمہ کا فن اور مشکلات

زبانیں اظہار مافی ضمیر کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ ہر قوم اور ہر علاقہ کے اعتبار سے ان میں تنوع پایا جاتا ہے۔ مختلف قسم کی زبانیں اور بولیاں بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ (الروم:22)

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے۔

ماہرینِ ترجمہ نے ترجمہ کے دو اقسام بیان کئے ہیں۔

1۔ لفظی ترجمہ

2۔ بامحاورہ یا مفہوم بر مبنی ترجمہ

لفظی ترجمہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک، تحت اللفظ ترجمہ جس میں اصل متن کے ہر لفظ کے بدلے میں ہدفی زبان کا ہم معنی لفظ رکھ دیا جاتا ہے۔ دوسرا، جملے کی سطح پر ہدفی زبان کے قواعد کے مطابق ہر

لفظ کے ترجمے کو برتا جاتا ہے۔ تحت اللفظ ترجمہ میں قباحت یہ ہے کہ قاری پڑھتے وقت جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتا ہے۔اس میں روانی اور تسلسل نہیں ہوتا۔الفاظ کو جوڑ کر خود ہی معنی سازی کرنی پڑتی ہے۔ جبکہ جملے کی سطح پر لفظ بہ لفظ ترجمہ کے مقابلے میں معنی کی ترسیل بہتر طریقہ سے ہوتی ہے۔ جس سے روانی عبارت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کے اُردو تراجم ان تینوں طریقوں سے کئے گئے۔اور ان تینوں میں مفہوم پر مبنی تراجم زیادہ مؤثر ثابت ہوئے۔

ترجمہ کی مشکلات

مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان رابطہ کا سب سے قدیم واسطہ ترجمہ ہی ہے۔ خواہ وہ تحریری شکل میں ہو یا زبانی۔ لیکن ترجمہ کے فن میں فنی پیچیدگیاں، دشواریاں اور فنی تقاضے بہت زیادہ ہیں ۔ ترجمہ کی راہیں بہت دشوار ہیں۔عام طور پر ترجمہ کی جو مشکلات بیان کی جاتی ہیں وہ ترجمہ کی نوعیت اور مقاصد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں۔

معلوماتی تراجم کے مقاصد اور مشکلات ادبی تراجم کے مقاصد اور مشکلات سے مختلف ہوتی ہیں۔ معلوماتی تراجم میں مترجم کا بنیادی مقصد معلومات کی ترسیل ہوتا ہے۔ ایسے تراجم اصل سے جتنے قریب ہوتے ہیں معلومات کی ترسیل کا حق اتنے ہی بہتر طور پر ادا کرتے ہیں۔ادبی تراجم کی مشکلات علمی تراجم کے مقابلہ میں دوچند ہو جاتی ہیں کیونکہ ادب میں ماورائے سخن بھی بات ہوتی ہے۔ تشبیہ، استعارے، کنایہ، رمز وایماء کی وجہ سے زبان معنوی محاسن سے بھرپور ہوتی ہے۔اس جمالیاتی سطح کو ترجمہ میں برتنا مشکل ہوتا ہے۔ یہاں بات کیا کہی جارہی ہے، سے زیادہ کیسے کہی جارہی ہے پر زیادہ زور ہوتا ہے۔

ترجمہ کی مشکلات اگر لفظی سطح پر دیکھی جائیں تو کسی زبان کے ہم پلہ لفظ دوسری زبان میں بہت کم ہوتے ہیں۔ ہر زبان کا بیانیہ الفاظ و محاورات مختلف ہوتے ہیں۔اسی لئے لفظ کے ہم معنی لفظ سے ترجمہ کرنا اکثر اوقات غلط ہوتا ہے کیونکہ الفاظ کے معنوں کے علاوہ عبارت کی ترتیب میں لفظ کا منصب اس کے معنی

متعین کرتا ہے۔ایسے موقعوں پر اہمیت لفظ کی نہیں بلکہ لفظوں کے تال میل کی ہوتی ہے [46]۔مفہوم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مرکزی خیال، مجموعی تاثر اور سیاق وسباق کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

کسی زبان کے متن کو دوسری زبان میں اصل زبان کی تمام خوبیوں کے ساتھ منتقل کرنے کا نام ترجمہ ہے کسی بھی زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے۔کیونکہ ہر زبان کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں ،ہر زبان کا اسلوب و محاورہ منفرد نوعیت کا ہوتا ہے۔ترجمہ کی مشکلات کے متعلق رابرٹ فراسٹ لکھتا ہے کی ترجمہ ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی ہے۔ترجمہ کے عمل میں اصل زبان کی چند خصوصیات کا نقصان گوارا کرنا پڑتا ہے۔دررا صل ترجمہ دو زبانوں کے درمیان سمجھوتہ یا مصالحت کا نام ہے۔مولانا اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں:

"ترجمہ بجائے خود ایسی چیز ہے کہ اس میں سوائے معانی کے کلام کی تمام حالتیں بدل جاتی ہیں"[47]۔

مؤثر یا کامیاب ترجمہ اسے کہا جاتا ہے جسے پڑھتے وقت قاری کو ترجمہ پن کا احساس نہ ہو،اس میں زبان کی فطری سلاست و روانی ہو۔اور اصل عبارت کے پڑھنے سے جو اثر قاری پر پڑتا ہے ترجمہ میں بھی اس تاثیر کا لحاظ رکھا جائے ایک طرح سے یہ باز تخلیق (Recreation)ہوتا ہے۔اس طرز کا ترجمہ مترجم کے لئے ایک چیلنج سے کم نہیں۔کیونکہ ہر زبان میں کچھ الفاظ اتنی وسعت اور ہمہ گیری لئے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کا متبادل دوسری زبان میں تلاش کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ ہر زبان ایک خاص تہذیب کی ترجمان ہوتی ہے۔ان تمام چیزوں کا ترجمہ میں لحاظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ادبی شہ پاروں، نظم و شعر کا ترجمہ نثری ترجمہ کے بالمقابل زیادہ کٹھن ہوتا ہے۔اس میں اوزان و قوافی ،صوتی آہنگ و جمال، نغمگی و موسیقی وہ چیزیں ہیں جن کو دوسری زبان میں برتا ہی نہیں جاسکتا۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ نظم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ مشکلات انسانی کلام کے ترجمہ میں در پیش ہیں۔ان سے زیادہ نازک اور مشکل کام مذہبی تراجم کا ہوتا ہے جس میں ذرا سی جنبش معنی کو کہیں سے کہیں پہنچادیتی ہیں۔اور مذہبی تراجم میں بھی قرآن جیسے معجزاتی کلام کا ترجمہ دنیا کا سب سے کٹھن کام ہے۔اسی لئے قرآن کے ترجمے کے ضمن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا قرآن کا ترجمہ ممکن ہے یا نہیں۔

کیا قرآن کا ترجمہ ممکن ہے؟

جہاں تک قرآن کے ترجمہ کا سوال ہے،اس میں ترجمہ کی مشکلات دوچند ہو جاتی ہیں۔قرآن کے اسلوب کے ضمن میں یہ بات پہلے آچکی ہے کہ یہ نظم ونثر کا خوبصورت امتزاج ہے۔

قرآن حکیم اپنے معنی و مضامین کے اعتبار سے دنیا کی منفرد کتاب اور کلامِ معجز ہے۔اپنے مضامین اور موضوعات کے پہلو سے اس میں بے حد تنوع اور وسعت پائی جاتی ہے جیسے سابقہ امتوں کے احوال (تاریخ)، احکامات، علمِ قانون، علمِ فقہ، علم العقائد، ما بعد الطبعیات حقائق، عالمِ آخرت کا تذکرہ وغیرہ۔مضامین کے علاوہ قرآن کے اسالیبِ بیان میں بھی تنوع اور وسعت ہے جیسے تشبیہ،استعارہ،ضرب الامثال جن کا تعلق علمِ بدیع، علمِ بیان اور علمِ معانی سے ہے۔اس لحاظ سے قرآن کے مترجم کو ان تمام علوم و فنون اور موضوعات سے واقفیت ضروری ہو جاتی ہے۔

امام ابن قتیبہ (متوفی 277ھ) نے قرآن کے اسالیب بیان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"قرآن کریم کا نزول ان تمام اسالیب بیان کے مطابق ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں کماحقہ، نہیں کر سکتا [48]۔

ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کے غیر عربی زبانوں میں تراجم کو ناجائز تصور کیا جاتا تھا۔امام شافعیؒ،امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ قرآن مجید کی غیر عربی زبان میں قراءت کو ناجائز تصور کرتے تھے[49]۔

ڈاکٹر محمد سلیم اسماعیل نے اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے حوالہ سے لکھا ہے:

"قرآن مجید کا فارسی یا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا درست نہیں کہ قراءت اس انداز سے کی جائے جس سے اس کا اعجاز برقرار رہے۔اس میں شبہ نہیں کہ ترجمہ میں اعجاز باقی نہیں رہتا اور عربی کے علاوہ باقی زبانوں میں وہ بات نہیں پائی جاتی جو عربوں کی خصوصیت ہے" [50]۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ قرآن جو عربی مبین میں ہے جب دوسری زبان میں ترجمہ کے ذریعہ برتا جاتا ہے تو اپنا معجزاتی اثر، خوبصورتی، صوتی آہنگ اور تاثراتی اسلوب سب کچھ کھو دے گا۔جیسا کہ کلام اللہ کا ہر لفظ انسانی الفاظ سے بدل جائے گا۔لفظ کا بہترین متبادل آیت کی نحو اور قواعد ، آیتوں میں قوی آہنگ (Rhythm)، خطابی انداز جو عربی میں ہے سب کچھ متاثر ہوتا ہے۔اور قرآن کے اسالیب کا فہم خود ایک دشوار امر ہے اور اس اسلوب کی پیروی ترجمہ میں کرنا ناممکن ہے۔اسی لئے اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ قرآن جب ترجمہ میں برتا جاتا ہے تو اس کی بہت سی خوبیاں ترجمہ میں نہیں آسکتیں۔

یہی احساس ایک عرصہ تک قرآن کے ترجمہ میں مانع رہا۔عبدالماجد دریابادیؒ کا قول ہے:

"Of all the great works, the Holy Quran is perhaps the least translatable." [51]

دنیا کے تمام عظیم (علمی) کارناموں میں قرآن کریم سب سے کم ترجمہ کی گنجائش رکھتا ہے۔

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اللہ کا کلام بہت کم ترجمہ کی گنجائش رکھتا ہے لیکن قرآن کے ترجمہ میں درپیش ان مسائل و مشکلات کے باوجود اس کی اہمیت کے پیش نظر سینکڑوں تراجم ہوئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ترجمہ قرآن کی ضرورت واہمیت

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جو بذریعہ وحی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔ یہ آخری ہدایت نامہ ہے جس پر قیامت تک آنے والے ہر انسان کی اصلاح و فلاح کا دارومدار ہے۔لہٰذا، قرآن کا فہم حاصل کرنا ہر انسان پر لازم ہے۔قرآن کریم عربی زبان میں اس قوم پر نازل کیا گیا جو عربی زبان کو بخوبی

سمجھتی تھی اور اللہ تعالی نے اس الٰہی ہدایت کو عربی زبان میں نازل کرنے کی غرض وغایت بھی یہی بتائی کہ جو کلام نازل ہورہا ہے اسے مخاطب قوم اچھی طرح سمجھے۔ چنانچہ سورہ یوسف میں ارشاد ہے۔" ہم نے اسے نازل کیا قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم اچھی طرح سمجھو"(یوسف:2)۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کلام صرف اہلِ عرب کے لئے نازل ہوا بلکہ یہ کلام سارے عالم کے انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے متعدد بار قرآن میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ ابراہیم میں فرمایا:" یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لئے اور بھیجا گیا ہے اس لئے کہ ان کو اس کے ذریعہ خبردار کیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا ایک ہی ہے اور عقل والے نصیحت حاصل کریں۔"

اُوپر کی آیتوں سے واضح ہے کہ قرآن کا نزول عربی زبان میں ہونے کے باوجود بھی اس کا سمجھنا سارے انسانوں کے لئے ضروری ہے۔ اور اللہ کی سنت کے مطابق بھی الٰہی ہدایات کی تفہیم مخصوص زبان بولنے والوں کو ان ہی کی زبان میں کرائی جائے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ آج بھی عجمیوں کے لئے قرآن فہمی کا بڑا ذریعہ ترجمہ قرآن ہی ہے۔ لہٰذا، ہر زبان میں ترجمہ کے ذریعہ قرآن کا پیغام پہنچانا نہ صرف ضروری ہے بلکہ فرض کفایہ بھی ہے۔

قرآن کے تراجم کی اہمیت کے ضمن میں محمد عارف اعظمی نے اپنی کتاب "تذکرہ مفسرینِ ہند" میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے اپنے ترجمہ قرآن "فتح الرحمٰن" کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> "اگر انصاف سے دیکھو تو قرآن کا نزول موعظت وہدایت ہی کے لئے ہوا ہے، اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی غنیمت ہے گو وہ فی نفسہ مقصود نہیں ہے، اس شخص کے حصہ میں بھلا کیا اسلام کی حقیقت آئے گی جو قرآن مجید کے مفہوم کو نہ سمجھے اور اس کو کیوں کر حلاوت مل سکتی ہے جو اس کے مضمون سے ناواقف ہو" [52]۔

ڈاکٹر عمر حیات نے اپنے مقالہ "فہمِ قرآن کے تقاضے اور ترجمہ قرآن حکیم" میں قرآن کے تراجم مسلسل ہونے کی وجہ یوں بیان کی:

"وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ لفظ اور اصطلاحوں کے متروک ہونے کے باعث نئی اصطلاحات ایجاد ہوتی ہیں۔ لہٰذا، کئی ترجمے اس لئے بھی لکھے گئے ہیں کہ وہ اس لسانی ارتقاء کا ساتھ دے سکیں۔" [53]

لسانی ارتقاء کے علاوہ کئی دوسرے مقاصد کے تحت بھی ترجمے کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے جیسے ترجمہ کو مزید عام فہم بنانا، نظم قرآن کو اجاگر کرنا وغیرہ۔

ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین کے مطابق:

"ہر دور کا انسانی معاشرہ مخصوص قدروں اور رُجحانات کا حامل ہوتا ہے لہٰذا، ہر زمانے میں علماء نے اس چیز کو ضروری سمجھا کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا جائے"[54]۔

قرآن کے نزول کے مقصد کی روشنی میں ترجمہ قرآن کی اہمیت اور بھی واضح ہوتی ہے۔ اللہ نے قرآن کو هُدًى لِّلنَّاسِ کہا ہے اور تمام عالم انسانیت کے لئے آخری ہدایت نامہ بنا کر بھیجا ہے۔ اور بعثتِ نبوی ﷺ کو تمام انسانوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ لا إِلَهَ إِلاَّ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (الاعراف:158)

اے محمدؐ، کہو کہ "اے انسانو، میں تم سب کی طرف اُس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اُس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے"۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (سبا:28)

اور (اے نبیؐ،) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

درج بالا آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن سے ہدایت کا تمام تر دار و مدار اس کے فہم پر منحصر ہے اور قرآن کے فہم کا حصول ہی ترجمہ قرآن کا اصل مقصد ہے۔

ترجمہ قرآن کی اہمیت وضرورت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اہلِ عرب جن کی زبان ہی عربی تھی، قرآن کی 'عربی مبین' کا فہم حاصل کرنے کے لئے تفسیر کا سہارا لیتے تھے۔ قرآن کے معنی کے فہم کے لئے سب سے پہلے عربی تفسیریں ہی وجود میں آئیں۔

تفسیر 'فَسَرَ' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ظاہر کرنا یا واضح کرنا ہے۔ اس طرح اصطلاحاً تفسیر کے معنی انکشاف کرنا، وضاحت کرنا، بیان کرنا یا شرح کے ہیں۔ تفسیر بنیادی طور پر معنی کے فہم میں مددگار ہوتی ہے۔ اس طرح عربی زبان میں تفسیر اور غیر عربی زبان میں ترجمہ، مقصد کے اعتبار سے مشترک ہیں۔

قرآن چونکہ نبی ﷺ کی ذات پر نازل ہوا اس لئے اس کے سب سے پہلے مفسّر رسول اللہ ﷺ ہی تھے اور آپ ﷺ کے فرائضِ نبوت میں قرآن کی تلاوت، حکمت کی تعلیم اور نفوس کا تزکیہ تینوں چیزیں شامل تھیں۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ- (الجمعہ:2)

وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود اُنھیں میں سے اٹھایا، جو اُنہیں اُس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اِس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

حکمت کی تعلیم سے مراد قرآن کی معرفت ہے جس کے متعلق امام سیوطی نے حضرت ابنِ عبّاس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے:

"اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاء وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيراً وَمَا يَذَّكَّرُ إِلاَّ أُوْلُواْ الأَلْبَابِ (البقرہ:269)۔اس آیت میں يُؤْتِي الْحِكْمَةَ کے بارے میں انہوں نے کہا"اس سے قرآن کی معرفت مراد ہے کہ اس میں ناسخ کیا ہے اور منسوخ کیا، محکم کیا ہے اور متشابہ کیا، مقدم اور موخر کیا ہے، حلال کیا ہے اور حرام اور امثال کیا ہے"[55]۔

صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین قرآنی آیات کی تفسیر کے لئے اللہ کے رسول ﷺ سے رجوع ہوتے تھے۔ حضور ﷺ سے قرآنی آیات کے معنی دریافت کرنے کے کئی واقعات کتبِ تفسیر اور احادیث میں مذکور ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات تفسیرِ آیات کے لئے وحی نازل ہوئی اور بعض اوقات حضور اکرم ﷺ نے خود تشریح فرمادی [56]۔

یہی نہیں بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فہمِ قرآن کو حفظِ قرآن پر مقدم رکھتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حفظِ قرآن سے زیادہ فہمِ قرآن کو ترجیح دیتے تھے۔ابن الانباری نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

"بے شک یہ بات مجھ کو بہت زیادہ پسند ہے کہ میں قرآن حکیم کی کسی ایک آیت کی معرفت حاصل کروں بہ نسبت اس بات کے کہ میں ایک آیت کو حفظ کروں[57]۔

امام سیوطیؒ کے مطابق صحابہ کرام قرآنی الفاظ کے مفہوم کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے اللہ کے رسول ﷺ سے رجوع ہوتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"قرآن شریف کا نزول محض عربی زبان میں ہوا، اور عربی زبان بھی کونسی، افصح العرب کے زمانے کی زبان۔ پھر اُن لوگوں کو بھی صرف قرآن شریف کے ظاہری اُمور اور احکام ہی کا علم حاصل ہوتا تھا لیکن اُس کے اندرونی مفہوم کی باریکیاں ان پر جب ہی منکشف ہوا کرتی تھیں جس وقت کہ وہ بحث اور غور سے کام لیتے اور اکثر باتوں کی بابت رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کرتے تھے۔ مثلاً، جس وقت قول تعالیٰ وَلَمْ يَلْبِسُواْ إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ نازل ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا"اور ہم میں

سے کون شخص ایسا ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہیں کیا ہے؟"(یعنی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا ہے)۔ پس اُس وقت نبی ﷺ نے آیتِ کریمہ کے لفظ ظلم کی تفسیر "شرک" کے ساتھ فرمائی اور اس پر دوسری آیت إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ کو بطورِ استدلال پیش کیا" [58]۔

نبی ﷺ کے بعد خلافت راشدہ میں دو تفاسیر ہوئیں۔ ڈاکٹر حمید شطاری کے مطابق ایک تفسیر ابی بن کعب ہے جو پانچویں صدی ہجری تک موجود تھی، دوسری تفسیر ابنِ عباس ہے جس کے متعدد نسخے آج بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں[59]۔

خلافت راشدہ کے بعد بھی عربی میں متعدد تفاسیر ہوئیں۔ جیسے خلیفہ عبد الملک اموی کی فرمائش سے پہلی صدی ہجری کے اواخر میں سعید بن جبیر نے قرآن کی تفسیر لکھی۔ تیسری صدی میں امام ابنِ جریر طبریؒ نے اپنی مشہور تفسیر لکھی۔ یہ امُّ التفاسیر کہی جاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے سلفِ صالح نے اس کتاب کو کس طرح سمجھا تھا [60]۔

قرآن کی تفسیر عربی زبان میں ہونے کے باوجود، قرآن کریم کے غیر عربی زبان میں ترجمہ کے تعلق سے علماء میں اختلاف رہا۔ چنانچہ ابتدائے اسلام میں غیر عربی زبان میں ترجمہء قرآن کو ناجائز قرار دیا جاتا تھا۔ اسلم جیراجپوری اپنی کتاب "تاریخ القرآن" میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی یہی خواہش رہی کہ جو قومیں اسلام میں داخل ہوں وہ قرآن کو اس کی اصل زبان یعنی عربی ہی میں پڑھیں چنانچہ موحدین کی سلطنت کے زمانے میں جن کا تسلط الجزائر سے اندلس تک تھا جب قرآن کا ترجمہ بربری زبان میں کیا گیا تو وہاں کے علماء نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور غیر عربی زبان میں اس کی تعلیم کو ناجائز قرار دیا۔ آخر کار وہ ترجمہ فنا کر دیا گیا۔ لیکن ائمہ اسلام نے اس میں تکلیف و نقصان دیکھ کر قرآن کے ترجمہ کی اجازت دے دی۔" [61]۔

قرآن کی تفہیم و تفسیر کی ضرورت سے متعلق امام سیوطیؒ لکھتے ہیں:

"اور ہم اُن باتوں کے محتاج ہیں جن کے محتاج صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ علاوہ بریں ہم کو احکامِ ظواہر میں سے بھی ایسے اُمور کے علم کی حاجت ہے جن کی احتیاج صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہر گز نہ تھی۔ اور ہمارے اس احتیاج کا سبب ہمارا احکامِ لغت کے مدارک (فہم) سے قاصر ہونا ہے، لہٰذا ہم کو تمام لوگوں سے بڑھ کر تفسیر کی ضرورت اور حاجت ہے [62]۔

نبی کریم ﷺ سے بھی یہ ثابت ہے کہ قرآن کا پیغام دعوتی غرض سے مختلف سربراہانِ مملکت کو ان کی زبان میں ترجمہ کے ذریعہ دیا گیا چنانچہ آپ ﷺ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عبرانی اور سریانی سیکھنے کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے پڑوسی سلطنتوں کے سربراہان کو جو دعوتی خطوط لکھے ان میں اکثر قرآنی آیات ہوتیں جن کے ترجمہ یا ترجمانی کے ذریعہ متعلقہ زبان میں سربراہِ مملکت کو ان آیات کا مفہوم سمجھایا جاتا تھا[63]۔

علامہ سرخسی نے اپنی کتاب المبسوط میں لکھا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اہلِ فارس کے مطالبہ پر بسم اللہ اور سورہ فاتحہ کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا [64]۔

عجمیوں کے لئے فہمِ قرآن کا سب سے بڑا ذریعہ ترجمہ قرآن ہی ہو سکتا تھا۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر علماء کے درمیان اس بات پر اتفاق ہوا کہ قرآن کا غیر عربی زبان میں ترجمہ جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔ اس کے لئے صحابہ کرام میں تفسیر کی روایت سے جواز پیش کیا گیا۔ یہی نہیں بعض علماء نے اسے فرضِ کفایہ کا درجہ دیا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس بات کو مزید تقویت ملتی ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُواْ كَآفَّةً فَلَوْلاَ نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُواْ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبہ:122)

اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔

اس آیت میں اپنی اپنی قوم میں جاکر دین کا فہم لوگوں میں پیدا کرنے کا حکم ہے جس سے مراد غیر عربی علاقے بھی ہو سکتے ہیں، اس سے مادری زبان میں فہمِ دین کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اہلِ زبان کے لئے تعلیماتِ قرآنی کو سمجھنے میں دقت نہیں تھی۔ یہ انھیں کی زبان اور محاورے کے مطابق اُترا تھا لیکن جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا اور جزیرۃ العرب کے باہر بلادِ عجم میں جب قرآن پہنچا تو غیر عربی دان طبقے کو قرآن کے فہم میں مشکل درپیش ہوئی۔ ان کے لئے قرآن کی تعلیمات سے آگہی کے دو ہی راستے تھے۔ پہلا عربی زبان سے واقفیت حاصل کرنا اور دوسرا علاقائی زبان میں ترجمہ کے ذریعہ قرآن کا فہم حاصل کرنا۔

اوّل الذکر ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا قرآن کے پیغام کو آفاقی بنانے کے لئے ناگزیر تھا کہ اس کے پیغام کی ترجمہ کے ذریعہ دوسری زبانوں میں تفہیم کی جائے۔ قرآن کے ترجمہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کام کو قبولیت ان دو شرائط کی بنیاد پر دی گئی۔

1۔ قرآن کے ترجمہ کو قرآن کا درجہ نہیں حاصل ہوگا۔ کیونکہ قرآن کا بعینہ ترجمہ ممکن نہیں، یہ کتنا بھی صحت میں اور بہتر ہو ترجمانی ہی رہے گا۔ یعنی اصل عربی عبارت میں ہی یہ کلام اللہ ہے۔ غیر عربی زبان میں کلام اللہ کے معنوں کا ترجمہ ہے۔

2۔ عبادات میں اصل عربی عبارت کی تلاوت ہی قابل قبول ہوگی، ترجمہ محض تفہیم کا کام دے گا۔

یہاں اس نکتہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں ترجمہ قرآن کی تلاوت کو ائمہ اربعہ نے ممنوع قرار دیا۔ کیونکہ قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں ہوتا۔ امام ابو حنیفہؒ نے ابتداءً اس کی اجازت دی تھی لیکن بعد میں انھوں نے عربی میں ہی تلاوت کرنے کی تاکید کی [65]۔ البتہ قرآن سمجھنے اور دین کا فہم حاصل کرنے کے لئے قرآن کے ترجموں کی اجازت دی گئی۔ قرآن کے ترجموں سے غیر عربی دانوں کے لئے قرآن کا فہم حاصل کرنے کے دروازے کھل گئے۔

ترجمہ قرآن کی اسی اہمیت و ضرورت کے پیشِ نظر علماء وائمہ قرآن نے دنیا کی متعدد زبانوں میں قرآن کے ترجمے کئے۔اور یہ تراجم صدیوں سے انسانیت کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔

اُردو میں ترجمہ قرآن کی مختصر تاریخ

چودھویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں اُردو نثر کا آغاز دینی کتابوں سے ہوا۔

قرآن کریم کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ 270ھ /883ء میں کشمیر کے راجہ مہروک کے زمانے میں ہوا۔ یہ ترجمہ سورہ یٰس تک ہوا[66]۔ لیکن اردو میں تراجم و تفاسیر کا سلسلہ سولہویں صدی عیسوی کے آخر یعنی دسویں صدی ہجری سے شروع ہوا جو چند سورتوں اور پاروں پر مشتمل ہے[67]۔

ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم کے مطابق قدیم ترجمہ عبدالصمد بن عبدالوھاب خانؒ کا مکمل ترجمہ ہے جو 1087ھ مطابق 1676ء میں ترجمہ کیا گیا یہ ترجمہ 1632 صفحات پر مشتمل ہے[68]۔

مولوی عبدالحق کے مطابق دسویں صدی ہجری کے اوائل کے جزوی تراجم میں پارہ عم کا ایک ترجمہ اور دسویں صدی کے اواخر میں سورہ یوسف کا گجراتی اردو میں ترجمہ کیا گیا[69]۔

اردو کے ابتدائی تراجم میں قاضی محمد سنبھلی کا غیر مطبوعہ ترجمہ بھی شامل ہے جو انھوں نے 1131ھ میں لکھا تھا۔ یہ خالص اردو میں نہیں بلکہ عربی اور فارسی کے میل جول سے پیدا ہونے والی زبان میں تھا [70]۔

تفسیرِ حسینی: یہ کاشفی ہروی کی تفسیر کا پرانی دکنی زبان میں ترجمہ ہے۔ قیاساً گیارھویں صدی ہجری کے اواخر یا بارہویں صدی ہجری کے اوائل کا ترجمہ بتایا گیا ہے[71]۔

تفسیر قرآن مجید سورہ مریم تا آخر: یہ سورہ مریم، طٰہٰ، یٰس، صٰفّٰت، ص، زمر اور پارہ عم کا ترجمہ و تفسیر ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے قیاساً بعد گیارہویں صدی ہجری کی تصنیف ہے[72]۔

اٹھارویں صدی کے تراجم

اٹھارویں صدی میں شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ موضح القرآن (1205ھ /1790ء)اور شاہ رفیع الدینؒ کے تراجم کو تاریخی حیثیت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ان سے قبل اردو میں پانچ تراجم کا ڈاکٹر صالحہ نے تذکرہ کیا ہے جو درجِ ذیل ہیں:

1150ھ مطابق 1737ء: نامعلوم مخطوطہ، کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد دکن

1184ھ مطابق 1770ء: ترجمہ شاہ مراداللہ انصاری

1200ھ مطابق 1785ء: ترجمہ و تفسیر قرآن مطابق امامیہ مذہب (مخطوطہ)، ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد دکن

1200ھ مطابق 1785ء: نامعلوم مخطوطہ، ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد دکن

1205ھ مطابق 1790ء: قاضی سید نورالحق منعم [73]

شاہ مراد اللہ نے پارہ عم اور سورہ فاتحہ کا ترجمہ و تفسیر کی اس کے علاوہ مکمل ترجمہ "تفسیر مرادیہ" کے نام سے 1184ھ میں مکمل ہوااور 1247ھ میں ہوگلی میں طبع ہوا، یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ سے 21سال قبل لکھا گیا [74]۔

یہ تراجم مطبوعہ نہ ہونے کی وجہ سے یا مترجمین کے غیر معروف ہونے کی وجہ سے تاریخ میں اپنا مقام درج نہیں کروا پائے۔اس طرح شاہ برادران کے تراجم کو اولین اردو تراجم کی حیثیت سے تاریخی حیثیت حاصل ہوئی۔شاہ عبدالقادرؒ کے بعد شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ 1256ھ میں کلکتہ کے اسلامی پریس سے طبع ہو کر منظر عام پر آیا جبکہ یہ ترجمہ 1205ھ مطابق 1790ء میں مکمل ہو چکا تھا [75]۔

اس طرح اردو تراجم قرآن کی ابتداء ہوئی اور صالحہ عبدالحکیم کے جائزہ کے مطابق اٹھارویں صدی میں مطبوعات و مخطوطات ترجموں کا شمار 17 ہے۔جن میں اٹھارویں صدی کے جزوی تراجم سورہ یوسف ،

سورہ ہود (1000ھ)، تفسیر قرآن مجید سورہ مریم تا آخر 1100ھ: یہ سورہ مریم، طٰہٰ، یٰس، صٰفّٰت، ص، زمر اور پارہ عم کا ترجمہ و تفسیر ہے، سورہ نصر 1150ھ، ترجمہ و تفسیر پارہ عم 1210ھ شامل ہیں[76]۔

انیسویں صدی میں ترجموں کی فہرست بہت طویل ہے جسکی ابتداء 1218ھ مطابق 1803ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی ایماپر فورٹ ولیم کالج میں علماء کی ایک کمیٹی کے ترجمہ کے کام سے ہوتی ہے۔اس کمیٹی میں کاظم علی، امانت اللہ شیدا، میر بہادر علی، مولوی فضل اللہ، غوث علی حافظ شامل تھے۔یہ ترجمہ ایک سال میں 1219ھ مطابق 1804ء میں مکمل ہوا [77]۔

اس کے بعد عبد اللہ ہوگلی اور سید عبداللہ نے 1245ھ مطابق 1829ء میں ایک ترجمہ کیا[78]۔اس طرح انیسویں صدی میں ترجموں کا سلسلہ چلا اور مکمل تراجم کی تعداد 64 ہے۔اس کے علاوہ 22 جزوی تراجم ہوئے [79]۔

بیسویں صدی قرآن کے ترجمہ کے سلسلہ میں ایک انقلابی دور کی حیثیت رکھتی ہے۔اس عہد میں نہ صرف یہ کہ تراجم کی تعداد بہت زیادہ ہے بلکہ روایتی طرز سے ہٹ کر نئے اسلوب میں بھی ترجمے ہوئے۔اس دور میں 100 سے زائد نثری تراجم اور 49 منظوم ترجمے ہوئے [80]۔نثری تراجم میں محض ترجموں کے علاوہ 26 تراجم معہ مکمل تفاسیر، 37 جزوی تفاسیر اور 4 تفسیری حواشی کے ساتھ ہیں [81]۔ بیسویں صدی میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بیان القرآن، مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ کی تفسیرِ ثنائی، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کی کنز الایمان، مولانا محمود حسنؒ کی موضح الفرقان، مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی تفسیرِ ماجدی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفہیم القرآن، مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تدبّر قرآن، مولانا محمد شفیع دیوبندیؒ کی معارف القرآن، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ترجمان القرآن، مولانا وحید الدین خانؒ کی تذکیر القرآن کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

حوالہ جات

[1] مولانا حافظ صلاح الدین یوسفؒ، تفسیر احسن البیان، دار السلام، 2008ء، ص11

[2] ڈاکٹر صبحی صالحؒ، علوم القرآن، ترجمہ غلام احمد حریری، فرید بک ڈپو (دہلی)، 2003ء، ص35

[3] محمد اقبال کیلانیؒ، فضائلِ قرآن مجید، مکتبہ بیت السلام (الریاض)، ص93، 94

[4] ڈاکٹر صبحی صالحؒ، علوم القرآن، ترجمہ غلام احمد حریری، فرید بک ڈپو (دہلی)، 2003ء، ص32

[5] ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ، محاضراتِ قرآنی، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2015ء، ص69

[6] علامہ جلال الدین سیوطیؒ، الاتقان فی علوم القرآن، دار الاشاعۃ (کراچی)، 2008ء، جلد اول، ص131

[7] ڈاکٹر صبحی صالحؒ، علوم القرآن، ترجمہ غلام احمد حریری، فرید بک ڈپو (دہلی)، 2003ء، ص30

[8] ڈاکٹر اسرار احمدؒ، تعارفِ قرآن، اریب پبلیکیشنز، دہلی، 2015ء، ص30

[9] ایضاً

[10] مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مقدّمہ تدبرِ قرآن، فاران فاؤنڈیشن (لاہور)، 2009ء، ص15

[11] ابو مسعود عبد الجبار، عربی زبان وادب، علمی کتب خانہ (لاہور)، 2014ء، ص775

[12] مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مقدّمہ تدبرِ قرآن، فاران فاؤنڈیشن (لاہور)، 2009ء، ص15

[13] علامہ جلال الدین سیوطیؒ، الاتقان فی علوم القرآن، دار الاشاعۃ (کراچی)، 2008ء، جلد اول، ص268

[14] الطاف احمد اعظمی، تفسیر قرآن کے اصول و مسائل، مکتبہ الحسنات (دہلی)، 2010ء، ص127

[15] عبید اللہ فہد فلاحی، قرآنِ مبین کے ادبی اسالیب، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 2000ء، ص9

[16] عبید اللہ فہد فلاحی، قرآنِ مبین کے ادبی اسالیب، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 2000ء، ص21

[17] مولانا محمد حنیف، مطالعہ قرآن،، فرید بک ڈپو (دہلی)، 2005، ص133

[18] الطاف احمد اعظمی، تفسیر قرآن کے اصول و مسائل، مکتبہ الحسنات (دہلی)، 2010ء، ص149

[19] الطاف احمد اعظمی، تفسیر قرآن کے اصول و مسائل، مکتبہ الحسنات (دہلی)، 2010ء، ص145

[20] ڈاکٹر محمود غازی، محاضراتِ قرآنی، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2015ء، ص333

[21] عبید اللہ فہد فلاحی، قرآنِ مبین کے ادبی اسالیب، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 2000ء، ص106

[22] شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر مولانا محمد رفیق چودھری، الفوزالکبیر، مکتبہ قرآنیات (لاہور)، ص149

[23] سید قطب شہیدؒ، مترجم غلام احمد حریری، قرآن کے فنی محاسن، فرید بک ڈپو (دہلی)، ص145

[24] مقدمہ ابن خلدون، ترجمہ مولانا راغب رحمانی، نفیس اکیڈیمی (کراچی)، 2001ء، جلد دوم، ص405

[25] شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر مولانا محمد رفیق چودھری، الفوزالکبیر، مکتبہ قرآنیات (لاہور)، ص150

[26] شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر مولانا محمد رفیق چودھری، الفوزالکبیر، مکتبہ قرآنیات (لاہور)، ص149

[27] مولانا صدرالدین اصلاحیؒ، قرآن مجید کا تعارف، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 2013ء، ص27

[28] علامہ جلال الدین سیوطیؒ، الاتقان فی علوم القرآن، دارالاشاعۃ (کراچی)، 2008ء، جلد دوم، ص252

[29] ڈاکٹر اسرار احمدؒ، تعارفِ قرآن، اریب پبلیکیشنز، دہلی، 2015ء، ص104

[30] مولانا محمد فاروق خان، کلامِ نبوّت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (دہلی)، 2007ء، جلد اول، ص241

[31] ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ، محاضراتِ قرآنی، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2015ء ص262

[32] ڈاکٹر اسرار احمدؒ، تعارفِ قرآن، اریب پبلیکیشنز، دہلی، 2015ء، ص112

[33] الزخرف:58

[34] مولانا مفتی تقی عثمانیؒ، علوم القرآن اور اصولِ تفسیر، فرید بک ڈپو (دہلی)، 2005ء، ص250

[35] القمر:45

[36] الروم:2

[37] آل عمران:122

[38] ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم، قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء، ص53

[39] مولانا ذوالفقار احمد نقشبندیؒ، قرآن کے ادبی اسرار و رموز، دارالکتاب (دیوبند)، ص88

[40] علامہ جلال الدین سیوطیؒ، الاتقان فی علوم القرآن، دارالاشاعۃ (کراچی)، 2008ء، جلد دوم، ص256

[41] ایضاً، ص257

[42] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن، جلد5، ص175، 176

[43] مولانا محمد حنیف ندویؒ، مطالعہ قرآن، ص123

[44] علامہ جلال الدین سیوطیؒ، الاتقان فی علوم القرآن، دارالاشاعۃ (کراچی)، 2008ء، جلد دوم، ص256

[45] ایضاً

[46] ڈاکٹر قمر رئیس، ترجمہ کا فن اور روایت، ایجوکیشنل بک ہاؤس (علی گڑھ)، ص85

[47] مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوریؒ، تاریخ القرآن، مطبع فیضِ عام (علی گڑھ)، 1929ء، ص109

[48] ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم، قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء، ص70

[49] ڈاکٹر محمد سلیم اسماعیل، قرآنِ کریم کے غیر عربی زبانوں میں ابتدائی تراجم، مشمولہ مقالاتِ قرآنی کانفرنس، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، اپریل2008ء

[50] ایضاً

[51] عبدالماجد دریابادیؒ، مقدمہ انگریزی ترجمہ قرآن، دارالاشاعہ (پاکستان)، 1991ء

[52] محمد عارف اعظمی (مرتبہ)، تذکرہ مفسرینِ ہند، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی (یو۔پی)، 2013ء، حصہ دوم، ص159

[53] ڈاکٹر عمر حیات، فہم قرآن کے تقاضے اور ترجمہ قرآن حکیم، مشمولہ مقالاتِ قرآن کانفرنس، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، اپریل2008ء

[54] ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم، قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء، ص68

[55] علامہ جلال الدین سیوطیؒ، الاتقان فی علوم القرآن، دارالاشاعۃ (کراچی)، 2008ء، جلد دوم، ص369

[56] سید معروف شاہ شیرازی، قرآن سے صحابہ کا طریقہ استفادہ، مشمولہ سیّارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر، ادارہ معارف اسلام (کراچی)، جلد13، شمارہ5، نومبر1969ء، ص317

[57] علامہ جلال الدین سیوطیؒ، الاتقان فی علوم القرآن، دارالاشاعۃ (کراچی)، 2008ء، جلد دوم، ص370

[58] علامہ جلال الدین سیوطیؒ، الاتقان فی علوم القرآن، دارالاشاعۃ (کراچی)، 2008ء، جلد دوم، ص368،369

[59] ڈاکٹر سید حمید شطاری، قرآن مجید کے اُردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ 1914ء تک، نظام اردو ٹرسٹ (حیدر آباد)، 1982ء، ص26

[60] مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوریؒ، تاریخ القرآن، مطبع فیضِ عام (علی گڑھ)، 1929ء، ص107

[61] ایضاً

[62] علامہ جلال الدین سیوطیؒ، الاتقان فی علوم القرآن، دارالاشاعۃ (کراچی)، 2008ء، جلد دوم، ص369

[63] ڈاکٹر محمد سلیم اسماعیل، مقالہ قرآن کریم کے غیر عربی زبانوں میں ابتدائی تراجم، مشمولہ مقالاتِ قرآنی کانفرنس 2008ء

[64] ایضاً

[65] ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم، قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء، ص76

[66] ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم، قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء، ص81

[67] ڈاکٹر سید شاہد علی، اردو تفاسیر بیسویں صدی میں، کتابی دنیا (دہلی)، 2009ء، ص9

[68] ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم، قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء، ص83

[69] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء، ص22

[70] ڈاکٹر سید شاہد علی، اردو تفاسیر بیسویں صدی میں، کتابی دنیا (دہلی)، 2009ء، ص10

[71] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ،البلاغ پبلیکیشنز، 2010ء، ص22

[72] ایضاً

[73] ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم،قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء، ص83

[74] ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم،قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء، ص169

[75] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ،البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء، ص23

[76] ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم،قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء، ص85

[77] ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم،قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء، ص96

[78] ایضاً

[79] ایضاً،ص110

[80] ایضاً،ص165

[81] ڈاکٹر سید شاہد علی،اردو تفاسیر بیسویں صدی میں،کتابی دنیا(دہلی)،2009ء

باب سوّم

منتخب مترجمین کا تعارف

مولانا احمد رضا خان بریلویؒ

امام احمد رضا خانؒ 10/شوّال 1272 ھ بروز اتوار مطابق 14/جون 1856ء شہر بریلی روہیلکھنڈ میں پیدا ہوئے۔ بھڑیچ نامی معزز پٹھان خاندان سے تھے [1]۔اصل نام محمد تھا۔ دادا نے احمد رضا تجویز کیا۔ رضا ان کا تخلص تھا اور عبدالمصطفٰی کا اضافہ انھوں نے خود کیا چنانچہ لکھتے ہیں:

خوف نہ رکھ اے رضاؔ تو ہے عبدِ مصطفٰی

تیرے لئے امان ہے تیرے لئے امان ہے [2]

آپ کے والد ماجد مولانا نقی علی خان بھی بہت بڑے عالم اور فقہ اسلامی کے ماہر مانے جاتے تھے۔ان کے جد امجد رضا علی خان بھی اپنے وقت کے بزرگ علماء میں شمار ہوتے تھے [3]۔اس طرح علم کی دولت انھیں ورثہ میں ملی۔

تعلیم و تربیت

امام احمد رضا بچپن سے ہی ذہین تھے اور قوتِ حافظہ سے نوازے گئے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اپنے والد ماجد کے پاس ہوئی۔ چار سال کی عمر میں ناظرہ قرآن ختم کیا اور 6 سال کی عمر میں "میلاد النبی ﷺ" کے موضوع پر پہلا خطاب کیا [4]۔ 13 برس کی عمر میں اپنے والد ماجد ہی سے درسیات کی تکمیل کی۔ میزان و منشعب مولانا مرزا غلام قادر بیگ سے پڑھی [5]۔

13 سال دس ماہ میں تفسیر، حدیث، کلام و فقہ کا علم حاصل کیا اور 14 شعبان 1286ھ میں دستارِ فضیلت حاصل کی [6] اور اسی روز رضاعت سے متعلق پہلا فتویٰ بھی لکھا۔ 1291ھ کے بعد چند دنوں رامپور میں قیام کیا۔ عبدالعلی ریاضی دان سے شرح چغمنی کے چند اسباق پڑھے [7]۔

علمِ قرآن، علمِ حدیث، اصولِ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، تفسیر، عقائد، کلام، نحو، صرف، معانی، بیان، بدیع، منطق، مناظرہ، فلسفہ، تکسیر، ہئیت، حساب اور ہندسہ جملہ 21 علوم انھوں نے اپنے والد ماجد سے حاصل کئے۔ بقیہ علوم دیگر اساتذہ سے حاصل کئے۔ جن اساتذہ سے آپ نے علمِ حدیث حاصل کیا ان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جیسے اکابر علماء بھی ملتے ہیں[8]۔

علمی خدمات

آپ کی علمی خدمات میں قلمی کارنامے باعثِ افتخار ہیں۔ آپ بچپن سے ہی تصنیفی صلاحیت کے حامل تھے۔ 'ہدایت النحو' کی شرح 11 برس کی عمر میں ہی لکھی۔ آپ علومِ عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے، آپ نے متعدد سائنسی موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں۔ جیسے پتھروں کی ساخت اور پیدائش سے متعلق ایک رسالہ اور علم صوتیات سے متعلق "البیان شافیا لغونو غراضیا" نامی ایک رسالہ لکھا۔ آپ نے عقائد و کلام پر بھی 120 سے زائد کتب تصنیف فرمائیں۔ تقریباً پچاس موضوعات پر ایک ہزار سے زائد کتابیں لکھیں۔ جن میں تفسیر، حدیث، عقائد، کلام و فقہ وغیرہ شامل ہیں[9]۔

انھوں نے عربی زبان میں متقدّمین کی تفاسیر میں حاشیے بھی لکھے۔ اس کے علاوہ کُتب حدیث میں بھی صحیح بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ وغیرہ پر حاشیے لکھے۔ علاوہ ازیں عربی زبان میں 37 کتابیں لکھیں[10]۔

علمی خدمات میں ان کی ایک بڑی خدمت ترجمہء قرآن بھی ہے۔ یہ ترجمہ "کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن" کے نام سے 1330ھ میں شائع ہوا۔ ان کا دوسرا بڑا شاہکار "فتاویٰ رضویہ" ہے جو بارہ (12) جلدوں میں ہے اور ہر جلد 1000 صفحات پر مشتمل ہے[11]۔

امام رضاؒ کو عربی، اردو اور فارسی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ ان کے فتاویٰ "فتاویٰ رضویہ" 12 مجلدات میں ہیں۔ 150 سے زائد رسائل ہیں۔ یہ فتاویٰ تین زبانوں پر مشتمل ہیں: اردو، فارسی اور

عربی۔ایک فتویٰ انگریزی میں بھی ہے۔یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مولانا مختلف زبانوں پر قادر الکلام تھے۔

امام احمد رضاؒ عصری و دینی علوم دونوں کے عالم تھے۔ چنانچہ علومِ دینیہ کے علاوہ متعدد سائنسی موضوعات پر کتب و رسائل تصنیف کیں۔علم توقیت، علم ہیئت، نجوم، تکسیر اور جفر پر بھی سو سے زیادہ رسائل تحریر کئے[12]۔

کنزالایمان فی ترجمۃالقرآن

یہ ترجمہ مولانا احمد رضا خانؒ نے زبانی لکھوایا جسے آپ کے شاگردِ خاص مولانا امجد علی نے تحریر کیا۔یہ ترجمہ 13 ماہ کے عرصہ میں 1330ھ (1911ء) میں مکمل ہوا۔اس ترجمہ کی تفسیری حواشی مولانا نعیم الدین مرادآبادیؒ نے "خزائن العرفان فی تفسیر القرآن" کے نام سے لکھی۔

اس ترجمہ پر کئی تفسیری حاشئے لکھے جا چکے ہیں اور متعدد زبانوں میں تراجم بھی ہوئے جیسے انگریزی، سندھی، بنگلہ وغیرہ۔ یہ ترجمہ و تفسیر 880 صفحات پر مشتمل ہے۔ ترجمہ کا نہج نہ مکمل طور پر لفظی ہے نہ بامحاورہ۔دراصل غیر مربوط اور ٹوٹے ہوئے جملوں میں ترجمانی کی گئی ہے۔

آیت کی تفسیر کے دوران کبھی کبھی بعض آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہیں۔احادیث کا مکمل حوالہ اور راوی کا ذکر نہیں ملتا۔اکثر حدیث کا مفہوم بیان کیا جاتا ہے اور لکھا جاتا ہے کہ بخاری شریف میں ہے یا دیگر۔

تفسیر کے آخر میں فہرستِ مضامین قرآن مجید درج ہے جس سے بریلوی حضرات کے عقائد کا اندازہ ہو جاتا ہے جو کہ جمہور علماء کے خلاف ہے مثلاً بشریتِ رسول ﷺ، نبیؐ کا عالمِ غیب ہونا، کراماتِ اولیاء، نبیؐ کو نور کہنا وغیرہ۔

کہیں انبیاء کے معجزوں کو دلیل بنا کر اولیاء یا محبوبانِ خدا دور سے دیکھتے، سنتے اور مدد کرتے ہیں کی تاویل کی گئی تو کہیں انھیں مشکل کشا اور صاحبِ عطا گردانا گیا اور بزرگوں کے مقامات کو یادگار بنانے کا غیر

معقول جواز پیدا کیا گیا۔اسی بناپر علمائے جمہور نے اس ترجمہ کو قبول نہ کیااور اس پر رابطۂ عالمِ اسلامی کی جانب سے روک لگادی گئی[13]۔باوجود اس کے یہ ترجمہ بریلوی حلقہ میں بہت مقبول ہوا۔اس ترجمہ میں خدااور رسولؐ کے ادب کا خصوصی لحاظ رکھا گیااور بعض مقامات پر ان کا ترجمہ ہم عصر ترجموں کے مقابلے میں کافی بہتر بھی ہے۔

مولانا محمد جوناگڑھیؒ

مولانا محمد جوناگڑھیؒ جلیل القدر علماء میں سے تھے۔آپ کی پیدائش 1890ء میں گجرات کے ضلع کاٹھیاواڑ کے علاقہ جوناگڑھ میں ہوئی۔یہ علاقہ متحدہ ہندوستان میں اسلامی ریاست کے نام سے مشہور تھا۔آپ خطیب الہند کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ کے والد محترم محمد ابراہیم غلّہ کے تاجر تھے اور آپ کی والدہ کا نام بی بی حوّا تھا۔ان کے والد ابتداء ہی سے کتاب و سنّت پر عمل کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔تقلیدِ جامد کے خلاف تھے اور اتباعِ محمدی ﷺ کو ترجیح دیتے تھے۔

مولانا محمد جوناگڑھیؒ نے ابتدائی تعلیم مولانا عبداللہ جوناگڑھیؒ سے حاصل کی۔آپ کی ابتدائی تعلیم بہت معمولی تھی۔ابتدائی تعلیم کے بعد عطر فروشی کی تجارت کی اور امینہ نامی ایک نیک سیرت لڑکی سے ان کا نکاح ہوا لیکن بہت جلد وہ داعئ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔اسی صدمہ سے دوچار ہو کر وہ بہت مغموم رہنے لگے۔بالآخر وطن چھوڑ کر دہلی روانہ ہو گئے۔اس وقت دہلی علم و فن کا گہوارہ تھا۔دہلی آکر 22 سال کی عمر میں انھوں نے "مدرسہ امینیہ" میں داخلہ لیا۔لیکن طریقہ تعلیم میں قرآن وحدیث کے بجائے اقوال ائمہ کی روشنی میں مسائل پر غور کیا جاتا تھا۔اسی وجہ سے وہ بہت جلد وہاں سے نکل گئے۔بعد ازاں صدر بازار دہلی کے معروف ادارہ "دارالکتاب والسنہ" میں شمولیت اختیار کی جس کے بانی مولانا عبدالوہاب دہلویؒ تھے۔

حصولِ تعلیم

مولانا محمد جوناگڑھیؒ بڑے شوق سے علم حاصل کرتے تھے۔اللہ نے آپ کو غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی۔ مولانا عبد الوہاب دہلویؒ کے علاوہ محدث مولانا عبدالرحیم غزنویؒ اور مولانا عبدالرشید کے تعلیمی ادارے سے بھی مستفید ہوئے[14]۔

1913ء میں آپ علومِ نقلیہ کی تحصیل میں سر گرم رہے۔ بعدازاں علومِ عقلیہ یعنی منطق، فلسفہ و اصولِ مناظرہ وغیرہ دہلی کے مشہور عالم محمد اسحاق دہلوی اور مولانا ایوب پارچہ سے پڑھے۔ یہ حضرات دارالحدیث رحمانیہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے اجمیری گیٹ میں مدرسہ محمدیہ قائم کیا جہاں دوسرے اساتذہ کے ساتھ محمد جوناگڑھیؒ نے بھی تعلیم وتدریس کی خدمات انجام دیں۔اسی دوران مولانا نے تصنیف وتالیف کی سر گرمیوں کا آغاز کیا۔ ساتھ ہی "گلدستہء محمدیہ" نامی ایک ماہنامہ اجراء فرمایا جس کا مقصد تبلیغ واشاعتِ دین تھا۔اس طرح آپ میدان صحافت سے بھی جُڑے ہوئے تھے۔ یہ ماہنامہ 1921ء میں 'اخبارِ محمدی' کے نام سے پندرہ روزہ کی صورت میں شائع ہونے لگا[15]۔اور 1942ء تک یعنی 21 سالہ مدت تک جاری رہا۔اس اخبار کے مدیر ابتداء سے محمد جوناگڑھیؒ ہی رہے اور وفات 1941ء تک آپ نے ہی یہ ذمہ داری نبھائی۔

مولانا محمد جوناگڑھیؒ میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیاں جمع فرمادی تھیں۔ وہ بیک وقت مقرر و خطیب، مصنف، مناظر، معلم اور مترجم بھی تھے۔ان کا اندازِ خطابت اور اسلوبِ تقریر نہایت پُر جوش اور پُر تاثیر تھا۔

تراجم و تصانیف

آپ کے تراجم میں اہم کارنامہ تفسیر ابنِ کثیر کا اُردو ترجمہ ہے جو تفسیرِ محمدی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ آپ نے چھ سال کی مدت میں مکمل کیا[16]۔ان کا ترجمہ نہایت سلیس اور رواں ہے۔ جس

سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا محمد جوناگڑھیؒ ترجمہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔

تفسیر ابنِ کثیر کے علاوہ "اعلام الموقعین" کا ترجمہ "دینِ محمدی" کے نام سے کیا۔ یہ حافظ ابن القیم الجوزیہؒ (691ھ۔751ھ) کی شاہکار کتاب ہے۔ یہ ترجمہ دو جلدوں (جلد اول 611 صفحات اور جلد دوم 638 صفحات) پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ 1934ء میں شروع ہوا اور بتاریخ 22 ربیع الآخر 1356ھ مطابق 2 جولائی 1937ء میں اختتام پذیر ہوا[17]۔ اس ترجمہ کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا محمد جوناگڑھیؒ کو ایک مکتوب روانہ کیا جس میں اس کتاب کی افادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے ترجمہ پر انھیں مبارکباد دی اور اس ترجمہ کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی ترغیب بھی دی۔

مولانا آزادؒ کے مکتوب سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا محمد جوناگڑھیؒ کا یہ ترجمہ ایک بڑا علمی کارنامہ ہے۔ مولانا آزادؒ کے یہ مکتوبات اعلام الموقعین (اردو) میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

یہ دو تراجم آپ کے شاہکار ہیں اس کے علاوہ آپ کے دیگر علمی کتابوں کے عربی سے اردو تراجم درج ذیل ہیں:

1۔ سنتِ محمدی، یہ امام محدث محمد حیات کی عربی تالیف "فتح الغفور فی وضع الیدی علی الصدور" کا اُردو ترجمہ ہے۔

2۔ برہانِ محمدی، یہ جزء رفع الیدین کا اردو ترجمہ ہے۔

3۔ سیرتِ محمدی، یہ امام ابو جعفر کی عربی کتاب "خلاصۃ السیر" کا اردو ترجمہ ہے۔

4۔ امامِ محمدی، یہ علامہ خطیب بغدادی کی مشہور کتاب تاریخِ بغداد کا اردو ترجمہ ہے۔

5۔ فضائلِ محمدی، یہ ابو بکر احمد خطیب بغدادی کی تصنیف "شرف اصحاب الحدیث" کا اردو ترجمہ ہے۔

6۔ ایمانِ محمدی، یہ امام ابو بکر احمد البیہقی کی تصنیف "مختصر شعب الایمان" کا اردو ترجمہ ہے۔

7۔ عقائدِ محمدی، امام احمد بن حنبلؒ کی عربی کتاب "کتاب السنہ" کا اردو ترجمہ ہے۔

8۔ خطباتِ محمدی، نبی ﷺ کے خطبات کا اردو ترجمہ ہے۔اس کتاب میں نبی ﷺ کے گیارہ سو خطبات جو آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں پیش کئے تھے ، مختلف احادیث سے جمع کرکے سات جلدوں میں اس کا ترجمہ کرکے شائع فرمایا۔ یہ ان کہ آخری تالیف تھی اور اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی[18]۔

ان تراجم کے علاوہ آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد سو سے زائد ہے۔ان میں سے 72 کتابوں کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں:

درایتِ محمدی، زکوٰۃ محمدی، ہدایتِ محمدی، براتِ محمدی، انعامِ محمدی، اذانِ محمدی، مرحمتِ محمدی، مملکتِ محمدی، تعویذِ محمدی، جماعتِ محمدی، فرمانِ محمدی، حجِ محمدی، نصیحتِ محمدی، سلامِ محمدی، ریحانِ محمدی، ذمہ محمدی، غنیمۂ محمدی، توحیدِ محمدی، ثوبانِ محمدی، صراطِ محمدی، لوءلوءِ محمدی، صمصامِ محمدی، تائیدِ محمدی، ضربِ محمدی، آئینہ محمدی، سراجِ محمدی، مشکوٰۃ محمدی، شمعِ محمدی، تحفہء محمدی، ارشاد محمدی، مقالہ محمدی، نور محمدی، نکاح محمدی، ملت محمدی، اربعین محمدی، صیام محمدی، نماز محمدی، طریق محمدی، حقوق محمدی، شہادت محمدی، ظفر محمدی، عصائے محمدی، پیغام محمدی، قبلہء محمدی، قربانی محمدی، انصار محمدی، وظیفہ محمدی، مولود محمدی، فتح محمدی، حقیقت محمدی، دلائل محمدی، عقیدہ محمدی، صلوٰۃ محمدی، معراج محمدی، درود محمدی، میلاد محمدی، حیات محمدی، درہ محمدی وغیرہ[19]۔

بلاشبہ یہ بہت بڑا اور قابلِ قدر علمی اور تصنیفی ذخیرہ ہے جو محمد جونا گڑھیؒ کے علم و فضل کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اردو آپ کی مادری زبان نہیں تھی اس کے باوجود انھوں نے یہ تمام علمی خدمات "اردو" میں انجام دیں۔آپ گجراتی تھے اور اہل خانہ سے گجراتی میں ہی گفتگو کرتے تھے۔

1941ء کے شروع میں مولانا جونا گڑھی اپنے والد محترم اور بہن کی چند روز کی تقدیم وتاخیر سے وفات کی خبر سن کر اپنے آبائی وطن جونا گڑھ تشریف لائے اور دو ماہ کی مدت بعد وہ بھی اسی مقام پر وفات پا گئے۔اس طرح مولانا نے محض 51 سالہ حیات پائی۔ اتنی قلیل مدت میں انھوں نے بلا شبہ عظیم اسلامی خدمت انجام دی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

آپ کی ولادت 25 ستمبر 1903ء (1321ھ) کو حیدر آباد دکن (موجودہ مہاراشٹرا) کے شہر اورنگ آباد میں ہوئی۔

آبائی تعلق سادات کے گھرانے سے ہے۔ان کا سلسلہ نسب چالیس پشتوں کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے[20]۔

ان کے والد صاحب سید احمد حسن گو کہ پیشہ سے وکیل تھے لیکن جھوٹے مقدمات سے گریز کرتے تھے۔ان کے والدین کی زندگی مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ مولانا کی پیدائش کے ایک سال بعد ان کے والد نے وکالت چھوڑ دی اور زیادہ تر عبادات میں مصروف رہے[21]۔ مولانا مودودی کی تربیت میں ان کے والد صاحب کا اہم رول تھا۔ کمسن بچے کو مسجد لے جاتے اور علماء وفضلاء کی مجلس میں بٹھاتے، قرآن کی سورتیں یاد دلاتے۔ عربی اور فصیح اردو بولنے کی تعلیم ان کو ان کے والد صاحب نے ہی دی تھی[22]۔

تعلیم و تربیت

مولانا مودودیؒ کی ابتدائی تعلیم ان کے گھر پر ہی ہوئی۔ بچپن میں مولانا عبدالسلام نیازی صاحب سے اکتسابِ فیض کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے ہندوستان میں معقولات (فلسفہ، منطق، ریاضی) کے علوم اور عربی ادب میں ان کا ہمسر نہ تھا[23]۔

مولانا مودودیؒ نے نو دس سال کی عمر میں عربی ادب اور فقہ کی متعدد کتابیں پڑھ لی تھیں۔اس کے بعد 11 سال کی عمر میں مدرسہء فوقانیہ اورنگ آباد کی آٹھویں جماعت میں داخل ہوئے۔ یہاں پر کیمیاء، طبیعیات، ریاضی، جغرافیہ وغیرہ جدید علوم سے استفادہ کیا[24]۔13 برس کی عمر 1914ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

میٹرک کے بعد دارالعلوم حیدرآباد میں مولوی عالم میں داخلہ لیا۔اس وقت دارالعلوم کے صدر مشہور عالمِ دین مولانا حمید الدین فراہیؒ تھے۔ان سے مولانا نے قرآنی علوم سیکھے۔ چھ ماہ کے بعد والد صاحب کی علالت کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ ترک کر کے بھوپال تشریف لے گئے[25]۔ والد کے انتقال کے بعد 1918ء میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور اخبارات "تاج"، "مسلم" اور "الجمیعت" کی یکے بعد دیگرے ادارت سنبھالی۔اس کے بعد دہلی آئے اور مدرسہ دارالعلوم فتح پوری سے مولانا محمد شریف اللہ خان کے ہاں تفسیر بیضاوی، ہدایہ، علم معانی و بلاغت سیکھی اور سندِ فراغت حاصل کی[26]۔ قیامِ دہلی کے دوران دوبارہ عبدالسلام نیازی صاحب سے عربی ادب و انشاء، فلسفہ اور منطق کی تعلیم حاصل کی اور مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی کے ہاں جامع ترمذی، مؤطا امام مالک کا درس لیا[27]۔اسی دوران انگریزی سیکھی اور اتنی دسترس حاصل کی کہ فلسفہ، تاریخ، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات کا گہری نظر سے مطالعہ کر سکیں[28]۔

علمی خدمات

مولانا مودودیؒ کی ابتدائی تحریریں 1914ء سے شروع ہوتی ہیں جبکہ ان کی عمر 12 برس تھی۔ سیرتِ پاک پر 8 صفحات لکھے جو ان کی کم عمری میں بھی پختگی فکر کی غماز ہیں[29]۔انھوں نے 24 برس کی عمر میں "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے ان کے تخلیقی سفر کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔1928ء میں صحافت کو خیر آباد کہہ کر دہلی سے حیدرآباد منتقل ہوئے اور بالکلیہ طور پر تصنیفی کام میں جُٹ گئے۔1933ء میں حیدرآباد سے جاری ہونے والے رسالہ "ترجمان القرآن" کی ادارت سنبھالی اور اسے اقامتِ دین کی جدوجہد کا ذریعہ بنایا۔ مولانا مودودی کا شمار کثیر التصانیف مصنفین میں ہوتا ہے۔انھوں

نے اپنی 60 سالہ تصنیفی زندگی میں سو سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف کیں جو مختلف موضوعات جیسے قرآن، حدیث، سیرت، عقائد، عبادات، تاریخ، فلسفہ، تہذیب و تمدن، سیاست، معیشت، تعلیم، اجتماعیت، اخلاقیات، مغربی فکر پر تنقید وغیرہ پر محیط ہیں[30]۔ ان میں سے چند مقبول کتابیں یہ ہیں: دینیات، خطبات، پردہ، خلافت و ملوکیت، سنّت کی آئینی حیثیت، تنقیحات، تفہیمات (تین حصّے)، تصریحات، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصوّرات، اسلام اور جدید معاشی نظریات، مسئلہ قومیت، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات، سود، حقوق الزوجین، رسائل و مسائل (چار حصّے) وغیرہ۔ ان کتابوں کے علاوہ آپ نے جو تقریریں کیں ان کی تعداد ایک ہزار سے بھی زائد ہے[31]۔

مولانا کے اندر ترجمہ نگاری کی صلاحیت بھی کم سنی سے ہی پائی جاتی تھی۔ 13 برس کی عمر میں دو عربی کتابوں 'الاسلام والاصلاح' از شیخ عبد العزیز شاوش اور 'المراءۃ الجدیدہ' از قاسم امین کا اردو میں ترجمہ کیا[32]۔ اس کے علاوہ انھوں نے 1930ء میں ابن خلکان کے دو حصّوں (مصر کے فاطمی خلفاء) اور 1932ء میں 'الحکمتہ المتعالیہ فی الاسفار العقلیہ' نامی فلسفہ کی ادق کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا[33]۔ یہ کارنامے اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مولانا میں عربی زبان سے کماحقہ واقفیت کے ساتھ ترجمہ نگاری کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔

تفہیم القرآن

مولانا مودودی کا اہم ترین ادبی کارنامہ ان کی شہرہ آفاق تفسیر تفہیم القرآن ہے۔ یہ تفسیر 6 ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

انھوں نے قرآن حکیم کی ترجمانی و تفسیر کا کام فروری 1942ء میں شروع کیا جس کے اجزاء رسالہ "ترجمان القرآن" میں مسلسل شائع ہوتے رہے اور پورے 30 سال کی محنت و جانفشانی کے بعد یہ تفسیر 1972ء میں مکمل کی۔ ان 30 برسوں میں 4 مرتبہ جیل بھیجے گئے، قید و بند اور بیماری کی صعوبتیں جھیلیں۔ ارضِ قرآن کا سفر (حجاز، اردن، فلسطین، شام اور مصر) بھی کیا۔ اور قرآن کے تاریخی مقامات کا

مشاہدہ کیا، وہاں کی تصاویر اور نقشہ جات کو تفہیم القرآن میں بھی شامل کیا۔ اگرچہ تفہیم القرآن 30 برس کی مدت میں لکھی گئی لیکن مولانا کے مطابق یہ ان کی ساری زندگی کے مطالعہ کا نچوڑ ہے جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں:

"میں نے پچھلے 55 سال کے دوران فلسفہ، تاریخ، سائنس، اجتماعی علوم اور دینی علوم کا جتنا مطالعہ کیا ہے، ان سب سے اس تفسیر کے لکھنے کا کام لیا گیا"[34]۔

تفہیم القرآن میں ترجمانی کا طرز اختیار کیا گیا، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"لفظی ترجمہ میں روانیٔ عبارت، زورِ بیان اور بلاغت و تاثیرِ کلام کا فقدان ہوتا ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو جامہ پہنانے کے بجائے قرآن کے مفہوم و تاثیر کو عربی مبین سے اردوئے مبین میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی"[35]۔

تفہیم القران کا انداز دعوتی و تحریکی ہے، اس میں قرآن کو زندگی کے ہر معاملہ میں سرچشمہ ہدایت کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس میں عصری تقاضوں کا بھی لحاظ رکھا گیا۔ مولانا مودودیؒ نے تفسیر کے لیے بنیادی طور پر قرآن و حدیث کو ہی معیار بنایا، اس کے علاوہ اسلاف کی مستند تفاسیر سے بھی استفادہ کیا۔

مولانا محمود حسنؒ

مولانا محمود حسن 1268ھ مطابق 1851ء کو بریلی میں پیدا ہوئے[36]۔ آپ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی بھی عالم اور ادیب تھے۔ مولانا ذوالفقار علی ضلع سہارنپور کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ مدارس کے انسپکٹر تھے اور علم و ادب، عربی، فارسی اور اردو کے نہ صرف اساتذہ میں سے تھے بلکہ ان تینوں زبانوں کے امام تھے[37]۔ علاوہ ازیں وہ عربی زبان کے مشہور ادیب بھی تھے۔ دیوان الحماسہ، دیوان المنتہ اور سبع معلقات کی مفید اردو شرح حسبِ ترتیب تسہیل الدرایا، تسہیل البیان اور التعلیقات علی السبع المعلقات ان کی بہترین علمی یادگاریں ہیں۔ قصیدہ بردہ اور قصیدہ بانت

ساعد کی شرحیں بھی لکھیں۔ اس کے علاوہ تذکرۃ البلاغت نامی کتاب بھی لکھی جسے اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب سمجھا گیا[38]۔اس طرح مولانا محمود حسنؒ نے علمی اور ادبی ماحول میں پرورش پائی۔

تعلیم و تربیت

مولانا محمود حسنؒ کی تعلیم کی ابتداء 6 سال کی عمر میں ہوئی۔اس وقت انھوں نے حضرت میاں جی منگلوری سے قرآن پڑھی۔اس کے علاوہ اردو اور فارسی کی تعلیم شیخ عبداللطیف صاحب اور مولانا مہتاب علی صاحب سے حاصل کی[39]۔

5 محرم الحرام 1283ھ مطابق 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ اور مولانا محمود حسنؒ بعمر 15 برس پہلے طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم میں داخل کئے گئے۔اتفاق سے دیوبند کے پہلے استاد بھی انھیں کے ہم نام مُلّا محمود دیوبندی تھے[40]۔

1284ھ میں آپ نے کنزالد قائق، میبذی اور مختصر المعانی کا امتحان دیا۔1285ھ میں مشکوٰۃ المصابیح، ہدایہ اور مقاماتِ حریری پڑھیں[41]۔صحاح ستہ کا درس انھوں نے اپنے نامور استاد اور مشہور عالم مولانا قاسم نانوتویؒ سے لیا اور دو سال کی مدت میں 1289ھ میں اس کی تکمیل کی[42]۔1290ھ میں تحصیل علم سے فارغ ہوئے اور قاسم نانوتویؒ سے دستارِ فضیلت حاصل کی[43]۔آپ کے اساتذہ میں میاں جی منگلوری، شیخ عبداللطیف صاحب، مولانا مہتاب علی، مُلّا محمود صاحب اور محمد یعقوب نانوتوی کے نام ملتے ہیں۔ان حضرات کے علاوہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کی صحبت اور مدتِ دراز تک خدمت اور دونوں حضرات کی خاص توجہ اور تربیت نصیب ہوئی۔

تدریسی و علمی خدمات

تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد 1291ھ میں استاد و مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے اور تادمِ حیات اسی جامعہ سے وابستہ رہے۔ پہلی مرتبہ 1293ھ میں آپ نے ترمذی، مشکوٰۃ اور ہدایہ کا درس دیا اور 1295ھ میں صحیح بخاری کا درس دیا۔ درس حدیث آپ کا اہم

میدان تھا۔1308ھ میں صدر مدرس کے منصب پر فائز ہوئے اور آخری عمر تک اسی منصب پر فائز رہے۔ اس طرح آپ نے 40 برس تک دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں۔1294ھ میں آپ نے فریضہء حج ادا کیا۔اس دوران قاسم نانوتویؒ کے استاد حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ (جو اس وقت مکہ میں مقیم تھے) سے اجازت اور سندِ حدیث حاصل کی[44]۔مکہ سے واپسی کے بعد آپ حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے بیعت ہوئے اور خلافت واجازتِ بیعت سے مشرف ہوئے۔

خدمتِ حدیث سے متعلق تصنیفی کارنامے

1۔ تصحیح ابوداؤد سنن ابوداؤد کے اس دور کے مطبوعہ نسخوں میں متن میں متعدد کمیاں اور خامیاں تھیں۔انھیں کی تصحیح کا بیڑہ مولانا نے اُٹھایا۔اُنھوں نے ابوداؤد کے تمام دستیاب قلمی اور مطبوعہ نسخے جمع کروائے اور سب کا بدقتِ نظر مطالعہ، مقارنہ، مقابلہ و محاکمہ فرماکر صحیح نسخہ مرتب فرمایا۔1318ھ میں یہی نسخہ مطبعِ مجتبائی دہلی سے طبع ہوا۔

2۔احسن القراء فی توضیح اوثق العریٰ نامی کتاب تالیف فرمائی جس میں دیہات میں جمعہ کے مسئلہ کے تعلق ارشاداتِ حدیث اور اقوالِ صحابہ وغیرہ سے استدلال کیا گیا۔

3۔ایضاح الادلہ (1295ھ)

4۔ادلہ کاملہ نامی دو گراں قدر تالیفات ہیں جو احناف کے خلاف ترکِ حدیث کے الزامات کے رد میں مرتب ہوئی۔

5۔ تقریرِ ترمذی (عربی) یہ آپ کے درسی تقریروں کا مجموعہ ہے اور ترمذی کے حاشیوں پر چھپ چکی ہے۔اس کا اردو ترجمہ 'الورد الشذی' کے نام سے طبع ہوا۔

6۔الفیض الجاری علی صحیح البخاری

شیخ الہند کی صحیح بخاری کی درسی تقاریر ہیں جو آپ کے تلامذہ نے مرتب کی تھیں[45]۔

7۔حاشیہ مختصر المعانی، مطبوعہ دہلی و کراچی، سعادالدین التفتازانی کی شرح 'تلخیص المفتاح' پر مفید حاشیہ ہے۔

8۔جہد المقل فی تنزیہ المعز والمذل، اس میں شاہ اسمٰعیل شہید کا دفاع کیا گیا اور معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا[46]۔

9۔الابواب والتراجم

یہ صحیح بخاری کے عناوین کی عالمانہ و محققانہ شرح ہے جو شروعِ کتاب یعنی بیانِ وحی سے لے کر کتاب العلم کے باب 'العلم والقنیہ فی المسجد' پر محیط ہے۔ یہ رسالہ 57 صفحات پر مشتمل ہے جو انھوں نے اسارتِ مالٹا کے دور میں لکھا تھا۔

آپ کی تصنیفات وتالیفات کے مقابلہ میں شیخ الہند کے علمی کمال اور فضل و مقام کا اندازہ آپ کے تلامذہ سے کیا جا سکتا ہے جنھیں آپ نے اپنی تعلیم و تربیت سے کندن بنایا۔ آپ کے مشہور و ممتاز تلامذہ میں حضرت علامہ انور شاہ کاشمیریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید فخر الدین احمد مراد آبادیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، مولانا اعجاز علی صاحبؒ، مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا عبدالرحمٰن کیمل پوریؒ وغیرہ سرفہرست ہیں[47]۔

مولانا نہایت منکسر المزاج اور سادہ طبعیت کے مالک تھے۔ وہ بنیادی طور پر مصلح، عالم اور شیخِ طریقت تھے۔ آپ کا اصل کام درس وتدریس اور تعلیم و تربیت ہی تھا لیکن ان کا اصل سرمایہ ان کے تلامذہ ہیں۔ اس بات کا اظہار ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ان الفاظ میں کیا:

> "جس طرح بارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی عظمت و جلالت اور خصوصاً جامعیتِ کبریٰ کا مظہر ان کی تصانیف ہیں، اسی طرح چودھویں صدی کے مجدّد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی عظمت و جامعیت کا مظہرِ کامل ان کے عظیم تلامذہ ہیں"[48]۔

ترجمہ قرآن

آپ کے تصنیفی کارناموں میں قابلِ قدر کام ترجمہ قرآن ہے۔انھوں نے یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ "موضح قرآن" کو بطورِ نمونہ سامنے رکھ کر کیااور اپنے ترجمہ کا نام بھی اسی کے وزن پر "موضح فرقان" رکھا[49]۔مولانا نے یہ ترجمہ دارالعلوم میں ربیع الاول 1327ھ مطابق اپریل 1909ء میں شروع کیا۔اس وقت آپ دارالعلوم دیوبند میں تھےاور اشغالِ علمی کی کثرت کی وجہ سے ترجمہ کا وقت بہت کم ملتا تھاچنانچہ سوا تین سالوں میں دس پاروں کا ترجمہ ہو سکا۔جمادی الثانی 1330ھ تک سورہ توبہ کی تکمیل ہوئی[50]۔

اس وقت ساری دنیا کے حالات بدامنی کا شکار تھے۔ترکوں کی حمایت اور برطانوی حکومت کی مخالفت کی بنیادپر شیخ الہند کو 29ربیع الثانی 1335ھ مطابق 21فروری 1917ء میں گرفتار کرکے جزیرہ مالٹامیں دیگر رفقاء کے ساتھ قید کر دیا گیا[51]۔یہ زمانہءاسیری مولانا کے لئے ترجمہءقرآن کے حوالہ سے مفید ثابت ہوا۔انھوں نے شوال 1335ھ کو ترجمہ کا کام دوبارہ شروع کیا۔زمانہءاسیری میں آپ کا یہ معمول تھا کہ آپ بعد نمازِ فجر واشراق کثرت سے تلاوتِ قرآن کرتے اور اس سے فارغ ہو کر کچھ ترجمہ قرآن تحریر فرماتے یا نظرِ ثانی کرتے تھے۔اس طرح ایک سال کی مدّت میں 2 شوال 1336ھ مطابق 11جولائی 1918ء کو باقی ماندہ ترجمہ پایہءتکمیل کو پہنچ گیا۔انھوں نے ترجمہ کی تکمیل کے بعد تفسیری حواشی بھی شروع کئے لیکن سورہ نساء تک لکھ پائے تھے کہ 20رہائی عمل میں آئی اور ہندوستان روانہ کر دئے گئے۔اس طرح 20رمضان المبارک 1338ھ کو بمبئی پہنچے اور یہاں پہنچنے کے دو ماہ بعد انتقال فرما گئے۔آپ کا چھوڑا ہوا حواشی کا باقی کام مولانا شبیر احمد عثمانی نے انجام دیا جو 1355ھ کو شائع ہوا۔یہ مصحف بڑے سائز کے 828صفحات پر مشتمل ہے[52]۔

نوٹ: میں نے اس مقالہ میں معارف القرآن کے حوالہ سے مولانا کا ترجمہ نقل کیا۔

حوالہ جات

[1] اعجاز الحق قدوسی، علامہ اقبالؒ اور حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، مشمولہ انوارِ رضا، عظمتِ ابرار نمبر، انٹر نیشنل غوثیہ فورم، جلد6، شمارہ3، 2012ء، ص84

[2] ایضاً

[3] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء، ص55

[4] ایضاً

[5] محمود احمد قادری، تذکرہ علمائے اہلِ سنّت، سنی دارالاشاعت (پاکستان)، 1992ء، ص42

[6] اعجاز الحق قدوسی، علامہ اقبالؒ اور حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، مشمولہ انوارِ رضا، عظمتِ ابرار نمبر، انٹر نیشنل غوثیہ فورم، جلد6، شمارہ3، 2012ء، ص207

[7] ایضاً

[8] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء، ص57

[9] ایضاً، ص58

[10] محمود احمد قادری، تذکرہ علمائے اہلِ سنّت، سنی دارالاشاعت (پاکستان)، 1992ء، ص46

[11] اعجاز الحق قدوسی، علامہ اقبالؒ اور حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، مشمولہ انوارِ رضا، عظمتِ ابرار نمبر، انٹر نیشنل غوثیہ فورم، جلد6، شمارہ3، 2012ء، ص89

[12] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء، ص60

[13] ڈاکٹر سید شاہد علی، اردو تفاسیر بیسویں صدی میں، کتابی دنیا (دہلی)، 2009ء، ص182

[14] پروفیسر ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن، بر صغیر کا اسلامی ادب چند نامور شخصیات، نقوش(لاہور)، 2010ء، ص36

[15] پروفیسر ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن، بر صغیر کا اسلامی ادب چند نامور شخصیات، نقوش(لاہور)، 2010ء، ص38

[16] پروفیسر ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن، بر صغیر کا اسلامی ادب چند نامور شخصیات، نقوش(لاہور)، 2010ء، ص53

[17] مولانا محمد جوناگڑھیؒ(مترجم)،اعلام الموقعین (اردو)،مکتبہ قدوسیہ(لاہور)،1999ء، ص638

[18] پروفیسر ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن، بر صغیر کا اسلامی ادب چند نامور شخصیات، نقوش(لاہور)، 2010ء، ص66

[19] پروفیسر ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن، بر صغیر کا اسلامی ادب چند نامور شخصیات، نقوش(لاہور)، ص69تا73

[20] ڈاکٹر ابو ذر اصلاحی، علاّمہ ابوالاعلیٰ مودودیؒ حیات و خدمات ،اریب پبلیکیشنز(دہلی)،2013ء، ص13

[21] ڈاکٹر محمد شکیل اوج،قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ،البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء، ص85

[22] سیدہ حمیرا مودودی، شجرہائے سایہ دار، مرکزی مکتبہ اسلامی(دہلی)،2007ء،ص11

[23] ایضاً،ص15

[24] متین طارق باغپتی، مولانا مودودیؒ اور فکری انقلاب، مرکزی مکتبہ اسلامی(دہلی)،1979ء، ص18

[25] داکٹر امتیاز احمد، مولانا مودودیؒ کی نثر نگاری، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 2010ء، ص18

[26] ایضاً

[27] سیدہ حمیرا مودودی، شجرہائے سایہ دار، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 2007ء، ص17

[28] متین طارق باغپتی، مولانا مودودیؒ اور فکری انقلاب، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 1979ء، ص20

[29] ڈاکٹر ابو ذر اصلاحی، علاّمہ ابوالاعلیٰ مودودیؒ حیات و خدمات، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2013ء، ص28

[30] ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، سید مودودی کا ذخیرہ علمی، مشمولہ ترجمان القرآن، ادارہ ترجمان القرآن (پاکستان)، مئی 2004ء

[31] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء، ص97

[32] ڈاکٹر ابو ذر اصلاحی، علاّمہ ابوالاعلیٰ مودودیؒ حیات و خدمات، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2013، ص29

[33] ایضاً، ص27

[34] داکٹر امتیاز احمد، مولانا مودودیؒ کی نثر نگاری، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 2010ء، ص91

[35] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مقدمہ تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (دہلی)، 2011ء، ص9، 10

[36] مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب، حضرت شیخ الہندؒ شخصیت، خدمات و امتیازات، مرکز الکوثر تعلیمی والخیری (مرادآباد)، 2014ء، ص14

[37] مولانا سید حسین مدنی، شیخ الہندؒ کے مختصر و نادر حالات (www.algazali.orgپر دستیاب ہے)

[38] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز، 2010، ص41

[39] مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب، حضرت شیخ الہندؒ شخصیت، خدمات و امتیازات، مرکز الکوثر تعلیمی والخیری (مراد آباد)، 2014ء، ص14

[40] مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب، حضرت شیخ الہندؒ شخصیت، خدمات و امتیازات، مرکز الکوثر تعلیمی والخیری (مراد آباد)، 2014ء، ص14

[41] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء، ص42

[42] مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب، حضرت شیخ الہندؒ شخصیت، خدمات و امتیازات، مرکز الکوثر تعلیمی والخیری (مراد آباد)، 2014ء، ص40

[43] ایضاً

[44] مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب، حضرت شیخ الہندؒ شخصیت، خدمات و امتیازات، مرکز الکوثر تعلیمی والخیری (مراد آباد)، 2014ء، ص61تا66

[45] ایضاً

[46] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء، ص53

[47] ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء، ص67

[48] ڈاکٹر اسرار احمدؒ، جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیمِ اسلامی، مکتبہ خدّام القرآن، لاہور، ص18

[49] ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اُردو تراجم، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ص293

[50] ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اُردو تراجم، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ص294

[51] مولانا حسین احمد مدنی، سفر نامہ شیخ الہند اسیرِ مالٹا، دینی بک ڈپو، دہلی، ص123

[52] ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اُردو تراجم، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ص296

باب چہارم

قرآنی تمثیلات کے تراجم کا تقابلی مطالعہ

تمہید

تمثیل ادب کی ایک خوبصورت قسم ہے جو مدّعا کی تفہیم کو آسان بناتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں انسانی فطرت کی رعایت رکھی ہے۔اس نے اپنے بندوں پر حق کو واضح کرنے کے لئے ہر قسم کے طریقہائے تفہیم کو اپنایا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُواْ وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلاَّ نُفُورًا ۝ (بنی اسرائیل: 41)

ہم نے اِس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کو سمجھایا کہ ہوش میں آئیں، مگر وہ حق سے اور زیادہ دور ہی بھاگے جارہے ہیں۔

ان ہی مختلف طریقوں میں سے ایک تفہیمی طریقہ تمثیلات بھی ہیں۔قرآن مجید میں آیاتِ امثال ایک ہزار ہیں[1]۔جن میں بعض اعمال، عقائد، سرگرمیوں اور نتائج وغیرہ کو مثالیں دے کر سمجھایا گیا۔ان تشبیہات کو 'امثال القرآن' کہا گیا ہے۔

جن دماغوں کی بناوٹ منطق واستدلال کو گرفت میں نہیں لاسکتی ان کے لئے تمثیل تیر بہ ہدف کا کام کرتی ہے۔یہ انسانی فطرت میں ودیعت کردہ ہے کہ وہ تمثیلات کے ذریعہ کوئی بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے اور تمثیلات تاثیرِ کلام میں بھی مثبت رول ادا کرتی ہے۔کوئی بھی بات منطق یا استدلال سے دقت سے اور تا دیر سمجھ میں آتی ہے لیکن اسی بات کو اگر تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیا جائے تو بڑی آسانی سے دل ودماغ کو متاثر کرتے ہوئے مدّعا کو واضح کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن جیسی مقدّس کتاب میں بھی تمثیلات کے ذریعہ افہام وتفہیم کی گئی ہے۔

قرآن میں تمثیلات بیان کرنے کی غرض وغایت

قرآن میں تمثیلات بیان کرنے کا مقصد تفہیمِ حق ہے۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ (العنکبوت:43)

یہ مثالیں ہم لوگوں (کی فہمائش) کے لیے دیتے ہیں، مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔

اور اس حق بات کو سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ چھوٹی سے چھوٹی چیز کی مثال دینے سے بھی عار نہیں فرماتا۔ کسی بھی تمثیل میں جس چیز سے تشبیہ دی جارہی ہے اس سے اہم یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ مثال موقع و محل کے اعتبار سے پوری طرح چسپاں ہوتی ہے یا نہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لاَ يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلاً مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُواْ فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُواْ فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلاً يُضِلُّ بِهِ كَثِيراً وَيَهْدِي بِهِ كَثِيراً وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلاَّ الْفَاسِقِينَ(البقرہ:26)

ہاں، اللہ اس سے ہر گز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں دے جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں، وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں، وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے اور گمراہی میں وہ انہی کو مبتلا کرتا ہے، جو فاسق ہیں۔

قرآن مجید میں امثال بیان کرنے کا مقصد تذکّر (نصیحت و یاد دہانی) اور تفکر بھی ہے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (الزّمر:27)

اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کی مثالیں بیان کر دی ہیں، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ(الحشر:21)

ہم ان مثالوں کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

قرآن میں تمثیلات، تشبیہات، تقابل، مماثلت اور یکسانیت کے ذریعہ طرح طرح سے فطرت کے مشاہدات کی طرف دعوتِ غور و فکر دی گئی تاکہ انسان ان تمثیلات میں موجود محسوس حقائق پر غور و فکر کریں اور اس کے ذریعہ غیر محسوس حقائق کو سمجھیں۔ مثلاً زندگی بعدِ موت کو مردہ زمین کے دوبارہ زندہ ہو کر لہلہا اُٹھنے کے مشاہدے سے سمجھیں[2]۔

قرآنی تمثیلات کی خصوصیات

تمثیلات میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں مؤثر طور پر وسیع مفہوم بیان ہو جاتا ہے۔ قرآن میں بیان کردہ تمثیلات دلائل سے بھرپور، برمحل اور اثر انگیز ہوتی ہیں اور آپس میں تضاد سے پاک ہیں۔ ایک ہی چیز کی مثال اگر ایک سے زائد مقامات پر آتی ہے تو نئے پیرایہ بیان اور نئی خوبصورتی کے ساتھ بیان ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں جتنی بھی مثالیں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائیں ہیں اسی بات کو سمجھانے کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔ مثال کے طور پر مشرکین نے اللہ کو چھوڑ کر جن کو بھی اپنا سہارا بنایا ہے، اس سہارے کو اللہ نے مکڑی کے جالے سے تشبیہ دی[3]۔ اس سے بہتر کمزوری و ناپائیداری کو بیان کرنے والی کوئی اور تمثیل نہیں ملتی۔ اسی طرح کافروں کے اعمال رائیگاں جانے کو شدید طوفان میں بکھر جانے والی راکھ سے تشبیہ دی گئی[4]۔

تمثیل کے تین ضروری اجزاء ہوتے ہیں: مثال (ممثل)، ممثل لہٗ اور وجہِ تمثیل۔ جیسے چاند جیسا چہرہ۔ چہرہ مثال ہے، چاند ممثل لہ، ہے اور حُسن و جمال وجہِ تمثیل ہے۔

مثال میں اس چیز کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ خوبی ہو یا زشتی، ممثل لہٗ کو مثال سے برتر ہونا چاہئے۔ خوبی ہو تو خوبی میں اور زشتی ہو تو زشتی میں۔ لیکن اگر ایسا ممثل لہٗ موجود ہی نہ ہو جو وجہِ تمثیل میں مثال سے برتر ہو تو مساوی یا اس سے کمتر چیز (ممثل لہٗ) سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ دونوں نظیریں موجود ہیں[5] جیسا کہ اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ[6] کے لیے ممثل لہ، اصل سے کمتر ہے، اسی طرح حُوروں کی خوبصورتی[7] کے لیے بھی کمتر چیز سے تشبیہ دی گئی۔ اسی طرح زشتی میں ممثل

لہ، مثال سے برتر بھی ملتا ہے جیسے علم رکھنے کے باوجود دنیا پرستی میں مبتلا ہونے والوں کو کتے سے [8] اور اُونچی آواز میں چیخنے چلاّنے کو گدھے کی آواز [9] سے تشبیہ دی گئی۔

قرآن میں امثال دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جو کسی بات کو مؤثر بنانے اور پوری طرح واضح کرنے کے لئے تمثیل کے پیرایہ میں لائی گئی ہے جیسے نیکی و بدی کی مثال، مخلصانہ اور ریاکارانہ انفاق کی مثال وغیرہ۔ دوسری تشبیہات، ضرب الامثال اور محاوروں کی شکل میں آئی ہیں، جیسے قیامت کے برپا ہونے کو پلک جھپکنے کی مدت سے تشبیہ دی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلِلّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلاَّ كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ إِنَّ اللّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (النحل:77)

اور زمین و آسمان کے پوشیدہ حقائق کا علم تو اللہ ہی کو ہے اور قیامت کے برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے، بلکہ اس سے بھی کچھ کم، حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

قیامت کے دن آسمانوں پر اللہ تعالیٰ کی مکمل گرفت کے منظر کو طومار میں کاغذ لپیٹنے کے عمل سے تشبیہ دی گئی۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاء كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ ۝ (الانبیاء : 104)

وہ دن جبکہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دئے جاتے ہیں جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتداء کی تھی اُسی طرح ہم پھر اُس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمّے، اور یہ کام ہمیں بہر حال کرنا ہے۔

ہمارا موضوع اول الذّکر تمثیلات سے متعلق ہے۔ اس قسم کی تمثیلات قرآن میں تقریباً 35 مقامات پر آئی ہیں [10]۔ ان تمام تمثیلات کو موضوعِ بحث لانا باعثِ تطول ہوگا۔ اسی لئے چند موضوعات

جیسے دنیوی زندگی مثال، کفار کے اعمال کی مثال، زندگی بعدِ موت کی مثال، منافق کی مثال، شرک کے ضعف کی مثال وغیرہ کو تقابل کے لئے چُنا ہے۔اس طرح آٹھ (8) تمثیلات کا انتخاب کر کے تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

تقابل کا طریقہ یہ اپنایا گیا ہے کہ تمثیل کے مکمل عربی متن کے بعد چاروں مترجمین کے اردو تراجم نقل کئے گئے۔ بعدازاں،ان تراجم میں اختلافات کے گوشوں کا جائزہ لغوی، معنوی اور ادبی لحاظ سے کیا گیا۔ چونکہ ہر تمثیل میں ان تینوں زاؤیوں سے اختلاف کا پایا جانا ضروری نہیں اس لئے ان تینوں میں سے جو بھی پہلو اختلافی پہلو کی حیثیت سے سامنے آیا اسے تحقیقی مطالعہ میں پیش کیا گیا۔

تقابلی جائزہ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

منافقین کی مثال

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَاراً فَلَمَّا أَضَاءتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لاَّ يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لاَ يَرْجِعُونَ ۝(البقرہ: 17،18)

ان کی کہاوت اس طرح ہے جس نے آگ روشن کی۔ تو جب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیریوں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سوجھتا۔ بہرے، گونگے، اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں۔(احمد رضاؒ)

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پس آس پاس کی چیزیں روشنی میں آئی ہی تھیں کی اللہ ان کے نور کو لے، گیا اور انھیں اندھیروں میں چھوڑ دیا، جو نہیں دیکھتے۔ بہرے، گونگے، اندھے ہیں۔ پس وہ نہیں لوٹتے۔(محمد جوناگڑھیؒ)

اِن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اُس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے اِن کا نور بصارت سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔(مودودیؒ)

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب روشن کر دیا آگ نے اس کے آس پاس کو تو زائل کر دی اللہ نے ان کی روشنی اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے۔، بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹیں گے۔(محمود حسنؒ)

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَاراً کے علی الترتیب تراجم کچھ اس طرح آئے: ان کی کہاوت اس طرح ہے جس نے آگ روشن کی، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی۔

مودودیؒ کے ترجمہ میں مَثَلُهُمْ كَمَثَل کے بعد وقفہ ہے اس کے بعد الَّذِي سے پوری تمثیل بیان ہو رہی ہے اس طرح مفہوم کے اعتبار سے اس تمثیل کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ جن منافقین کی مثال دے رہا ہے ان میں آگ جلانے والا شخص بھی شامل ہے۔ دوسرے یہ کہ آگ جلانے والا کوئی اور ہے اور جو لوگ اندھے، بہرے اور گونگے بنے ہوئے ہیں وہ مثال منافقین کی ہے۔ مودودیؒ کے سوا تینوں مترجمین نے پہلے والے مفہوم کو لیا ہے جبکہ مودودیؒ کے نزدیک آگ جلانے والے سے مراد ہدایت کی روشنی پھیلانے والے ہیں اور اس روشنی کو دیکھنے سے محروم لوگ منافقین کی مثال ہیں۔

کنزالایمان کی تفسیر کے مطابق یہ ان کی مثال ہے جنھیں اللہ نے کچھ ہدایت دی یا اس پر قدرت بخشی پھر انھوں نے اس کو ضائع کر دیا۔ اس میں وہ منافق بھی داخل ہیں جنھوں نے ایمان کا اظہار کیا لیکن دل میں کفر رکھ کر اقرار کی روشنی ضائع کر دی۔ ایسے بھی جنھیں فطرت سلیمہ عطا ہوئی اور دلائل کی روشنی نے حق کو واضح کر دیا مگر انھوں نے اس سے فائدہ نہ اُٹھایا اور گمراہی اختیار کی۔ ان معنوں میں ترجمہ کرنے والے مترجمین نے یہاں 'الَّذِي' کو 'الَّذِين' کے معنوں میں لیا ہے جیسا کہ تفسیر قرطبیؒ میں ہے۔

"مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَاراً" میں الَّذِي اگرچہ واحد ہے لیکن عربی زبان میں کبھی جمع کے لئے واحد اسم موصول بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح الَّذِي بمعنی الَّذِين ہے۔ اسی لئے آگے فرمایا "ذَهَبَ اللّهُ بِنُورِهِمْ"، یعنی جمع کی ضمیر ذکر فرمائی۔ کلام کے آغاز کو واحد پر اور آخر کو جمع پر محمول کیا[11]۔ اس کے برعکس مودودیؒ نے الَّذِي کو واحد کے معنوں میں ہی لیا۔ ان کے ترجمہ سے جو مفہوم سامنے آتا ہے وہ اس طرح ہے کہ ماحول روشن 'آگ کی روشنی' سے ہوا اور 'اللہ ان کا نور لے گیا' میں نور کا تعلق منافقین کے نورِ بصارت سے ہے۔ وہی آگ نہیں بجھی جو روشن ہوئی تھی۔ روشنی تو باقی ہے مگر دیکھنے کی صلاحیت ختم ہوئی۔ اس کے بعد ہی کے فقرے میں فرمانا کہ "صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ" یعنی حق بات واضح ہونے کے باوجود اندھے، گونگے اور بہرے ہیں۔ یہاں نور سے مراد نورِ بصارت کے سلب ہونے کا مفہوم زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ آگے اللہ تعالیٰ نے ان کے اسی وصف کی بات کی ہے کہ وہ ہدایت کے آجانے کے بعد بھی اندھے،

بہرے اور گونگے بنے ہوئے ہیں۔ تمام مفسّرین نے یہی مطلب بیان کیا ہے کہ وہ حق بات کہنے سے گونگے، دیکھنے سے اندھے اور سُننے سے بہرے ہیں۔

مودودیؒ کے موقف کی تائید لفظ اسْتَوْقَدَ کی تشریح سے بھی ہوتی ہے۔ اسْتَوْقَدَ باب استفعال سے ہے جیسے استغفار بمعنی مغفرت طلب کرنا، استسقاء بمعنی پانی طلب کرنا۔ اس طرح اسْتَوْقَدَ کے معنی جلانے کی طلب بمعنی روشنی کا ارادہ یا خواہش کا ہونا ظاہر ہے۔ مودودیؒ نے "اللہ کے بندے نے آگ جلائی" کا مفہوم اپنی تفسیر میں واضح کیا۔ اس سے مراد اللہ کے نبی ﷺ ہو سکتے ہیں کیونکہ ہدایت کو عام کرنے کی خواہش آپ ﷺ کے دل میں تھی۔ حق کی طلب میں غارِ حرا میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جب نبی ﷺ نے آگ بمعنی ہدایت کی روشنی پھیلائی تو منافقین کے دلوں نے اسے قبول نہ کیا اگرچہ بظاہر وہ اپنا مسلمان ہونا ظاہر کر رہے ہوں۔

اس تمثیل میں یہ موقف صرف مودودیؒ ہی کا نہیں ہے بلکہ 'تدبر قرآن' کے مترجم و مفسر مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے بھی اسی مفہوم میں ترجمہ کیا۔ البتہ انھوں نے نبی سے مراد موسیٰؑ اور منافقین کی جگہ یہودیوں کو مراد لیا ہے۔

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ کے لیے درج ذیل تراجم سامنے آئے۔

اللہ ان کا نور لے گیا، اللہ ان کے نور کو لے گیا، اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا، تو زائل کر دی اللہ نے ان کی روشنی۔ اس مقام پر مودودیؒ اور محمود حسنؒ کے ترجمہ سے آنکھوں کی روشنی کے زائل ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ باقی دو میں نور کی مراد غیر واضح ہے۔

اس تمثیل میں منافقین کی مثال بیان ہوئی ہے، ممثل لہ، آگ کے روشنی کو دیکھنے سے محروم رہنا (اندھا پن)، وجہِ تمثیل منافقین اپنے رویہ یعنی ہدایت سے منہ موڑنے کی وجہ سے ہی راہِ ہدایت سے محروم کر دئے گئے۔

حق اور باطل کی مثال

قُلْ مَن رَّبُّ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ قُلِ اللّهُ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُم مِّن دُونِهِ أَوْلِيَاء لاَ يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ نَفْعًا وَلاَ ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الأَعْمَى وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ أَمْ جَعَلُواْ لِلّهِ شُرَكَاء خَلَقُواْ كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۝أَنزَلَ مِنَ السَّمَاء مَاء فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاء حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاء وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللّهُ الأَمْثَالَ۝(الرعد:16،17)

تم فرماؤ کون رب ہے آسمانوں اور زمین کا، تم خود ہی فرماؤ اللہ۔ تم فرماؤ تو کیا اس کے سوا تم نے وہ حمایتی بنالئے ہیں جو اپنا بھلا برا نہیں کر سکتے ہیں۔ تم فرماؤ کیا برابر ہو جائیں گے اندھا اور انکھیارا یا کیا برابر ہو جائیں گی اندھیریاں اور اُجالا کیا اللہ کے لیے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں جنہوں نے اللہ کی طرح کچھ بنایا تو انہیں ان کا اور اس کا بنانا ایک سا معلوم ہوا تم فرماؤ اللہ ہر چیز کا بنانے والا ہے اور وہ اکیلا سب پر غالب ہے۔ اس نے آسمان سے پانی اتارا تو نالے اپنے اپنے لائق بہہ نکلے تو پانی کی رو اس پر ابھرے ہوئے جھاگ اٹھا لائی، اور جس پر آگ دہکاتے ہیں گہنا یا اور اسباب بنانے کو اس سے بھی ویسے ہی جھاگ اٹھتے ہیں اللہ بتاتا ہے کہ حق و باطل کی یہی مثال ہے، تو جھاگ تو پھک کر دور ہو جاتا ہے، اور وہ جو لوگوں کے کام آئے زمین میں رہتا ہے اللہ یوں ہی مثالیں بیان فرماتا ہے۔ (احمد رضاؒ)

آپ پوچھئے کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگا کون ہے؟ کہہ دیجئے! اللہ۔ کہہ دیجئے! کیا تم پھر بھی اس کے سوا اوروں کو حمایتی بنا رہے ہو جو خود اپنی جان کے بھی بھلے برے کا اختیار نہیں رکھتے۔ کہہ دیجئے کہ کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتا ہے؟ یا کیا اندھیریاں اور روشنی برابر ہو سکتی ہے۔ کیا جنہیں یہ اللہ کے شریک ٹھہرا رہے ہیں انہوں نے بھی اللہ کی طرح مخلوق پیدا کی ہے کہ ان کی نظر میں پیدائش مشتبہ ہو گئی ہو، کہہ دیجئے کہ صرف اللہ ہی تمام چیزوں کا خالق ہے وہ اکیلا ہے اور زبردست غالب ہے۔ اسی نے آسمان سے پانی برسایا پھر اپنی اپنی

وسعت کے مطابق نالے بہہ نکلے۔ پھر پانی کے ریلے نے اوپر چڑھے جھاگ کو اٹھالیا، اور اس چیز میں بھی جس کو آگ میں ڈال کر تپاتے ہیں زیور یا ساز و سامان کے لئے اسی طرح کے جھاگ ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ حق و باطل کی مثال بیان فرماتا ہے، اب جھاگ تو ناکارہ ہو کر چلا جاتا ہے لیکن جو لوگوں کو نفع دینے والی چیز ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے، اللہ تعالیٰ اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے۔ (محمد جوناگڑھیؒ)

اِن سے پوچھو، آسمان و زمین کا رب کون ہے؟ کہو، اللہ پھر ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو کیا تم نے اُسے چھوڑ کر ایسے معبودوں کو اپنا کارساز ٹھیرالیا جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ کہو، کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟ اور اگر ایسا نہیں تو کیا اِن ٹھیرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ اُس کی وجہ سے اِن پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟ کہو، ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ہے، سب پر غالب! اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے اور ویسے ہی جھاگ اُن دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں اِسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے۔ (مودودیؒ)

پوچھ کون ہے رب آسمان اور زمین کا، کہہ دے اللہ، کہہ پھر کیا تم نے پکڑے ہیں اس کے سوا ایسے حمایتی جو مالک نہیں اپنے بھلے اور بُرے کے، کہہ کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھنے والا، یا کہیں برابر ہے اندھیرا اور اُجالا کیا ٹھہرائے ہیں انھوں نے اللہ کے لئے شریک کہ انھوں نے کچھ پیدا کیا ہے جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہو گئی پیدائش ان کی نظر میں، کہہ اللہ ہی پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست، اتارا اس نے آسمان سے پانی پھر بہنے لگے نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق پھر اوپر لے آیا وہ نالا جھاگ پھولا ہوا، اور جن چیزوں کو دھونکتے ہیں آگ میں واسطے زیور کے یا اسباب کے اس میں بھی جھاگ ہے ویسا ہی، یوں بیان کرتا

ہے اللہ حق اور باطل کو، سو وہ جھاگ تو جاتا رہتا ہے سوکھ کر اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے سو باقی رہتا ہے زمین میں، اس طرح بیان کرتا ہے اللہ مثالیں۔ (محمود حسنؒ)

لفظ 'قُلْ' کے لیے یہ چار ترجمے سامنے آئے ہیں: تم فرماؤ، ان سے پوچھو، آپ پوچھئے، پوچھ۔ ان سب میں 'آپ پوچھئے' اُردو میں ادب کے اعتبار سے لائقِ ترجیح ہے۔ اور نبی ﷺ کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ ترجمہ محمد جوناگڑھیؒ کا ہے۔ 'تم' کے ساتھ 'فرماؤ' اردو میں غیر مستعمل ہے۔ 'آپ فرمایئے' ہو سکتا ہے۔ لیکن اس مقام پر 'فرمانے' کا نہیں 'پوچھنے' کا لفظ ہی آگے کی عبارت سے میل کھا رہا ہے۔ کیونکہ آگے سوالیہ جملہ آیا ہے۔

احمد رضاؒ کے علاوہ تینوں مترجمین نے سوالیہ جملے کی جگہ 'پوچھنے' اور بیانیہ جملے کی جگہ 'کہنے' کا مفہوم ادا کرنے والے الفاظ استعمال کئے جبکہ احمد رضاؒ نے ہر دو مقام پر 'تم فرماؤ' سے ترجمہ کیا۔ ان سب میں بہتر ترجمہ محمد جوناگڑھیؒ کا ہے۔ جبکہ 'پوچھ' اور 'کہہ' سے ترجمہ کرنا نبی ﷺ کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

هَلْ يَسْتَوِي الأَعْمَى وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا گیا:

کیا برابر ہو جائیں گے اندھا اور انکھیارا (بینا) یا کیا برابر ہو جائیں گی اندھیریاں اور اجالا، کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتا ہے؟ یا کیا اندھیریاں اور روشنی برابر ہو سکتی ہے، کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟، کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھنے والا، یا کہیں برابر ہے اندھیرا اور اُجالا۔

اس آیت میں باطل کو تاریکی اور باطل پرست کو اندھے سے اور حق کو روشنی اور حق پرست کو بینا سے تشبیہ دی گئی ہے اور استفہامیہ انداز میں دونوں کا ایک دوسرے کی ضد ہونا بتایا جا رہا ہے۔ جس طرح روشنی اور تاریکی برابر نہیں ہو سکتی اسی طرح حق و باطل برابر نہیں ہو سکتے۔ جہاں روشنی ہوتی ہے وہاں تاریکی نہیں اور جہاں تاریکی ہے وہاں بالکل بھی روشنی نہیں ہوتی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور کبھی بھی

یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو 'کیا برابر ہو جائیں گی؟'، 'کیا برابر ہوتے ہیں؟' اور 'کیا برابر ہوا کرتا ہے؟' کے مقابلہ میں 'کیا برابر ہو سکتا ہے؟' بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں شدت کے ساتھ یکسانیت کی نفی ہے، یہ ترجمہ محمد جوناگڑھیؒ کا ہے۔ اس مقام پر احمد رضاؒ نے يَسْتَوِي کا ترجمہ مستقبل کے صیغہ میں کیا ہے جبکہ حال کے صیغہ میں ترجمہ کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

أَمْ جَعَلُواْ لِلّهِ شُرَكَاء خَلَقُواْ كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ کے درج ذیل تراجم سامنے آئے۔

کیا اللہ کے لئے ایسے شریک ٹھہراتے ہیں جنھوں نے اللہ کی طرح کچھ بنایا تو انھیں ان کا اور اس کا بنانا ایک سا معلوم ہوا، کیا جنھیں یہ اللہ کے شریک ٹھہرا رہے ہیں انھوں نے بھی اللہ کی طرح مخلوق پیدا کی ہے کہ ان کی نظر میں تخلیق مشتبہ ہو گئی ہو، تو کیا ان ٹھیرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟، کیا ٹھہرائے ہیں انھوں نے اللہ کے لیے شریک کہ انھوں نے پیدا کیا ہے جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہو گئی پیدائش ان کی نظر میں۔

یہ دراصل جملہ استفہامیہ ہے۔ یہاں پر احمد رضاؒ اور محمود حسنؒ کے ترجمہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لفظ 'کیا' کا اطلاق 'شریک ٹھیرائے' پر ہے جبکہ مودودیؒ اور جوناگڑھیؒ کے ترجمہ میں 'کیا' کا اطلاق 'ان شریکوں نے کچھ تخلیق کیا؟' پر ہے اور یہی زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ جس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ 'جن لوگوں کو تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھیراتے ہو کیا انھوں نے بھی اللہ کی طرح کسی چیز کی تخلیق کی ہے؟'۔ اس طرح أَمْ کا اطلاق شریک ٹھہرانے پر نہیں بلکہ 'وہ شرکاء نے بھی کچھ پیدا کیا؟' اس بات پر ہے۔ تبھی مفہوم مبرہن ہو کر سامنے آتا ہے ورنہ مبہم ہو جاتا ہے۔

اگرچہ کنزالایمان کی تفسیر میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "اس وجہ سے کہ حق ان پر مشتبہ ہو گیا اور وہ بت پرستی کرنے لگے، ایسا نہیں ہے بلکہ جن بتوں کو وہ پوجتے ہیں اللہ کی مخلوق کی طرح کچھ بنانا تو کجا وہ بندوں کی مصنوعات کے مثل بھی نہیں بنا سکتے"[12]۔

لیکن یہ بات ترجمہ میں منتقل نہیں ہو پائی۔

احمد رضاؒ نے فَتَشَابَهَ کا ترجمہ 'ایک سا معلوم ہوا' سے کیا جبکہ دیگر مترجمین نے 'مشتبہ' سے کیا ہے۔ یہاں احمد رضاؒ کے ترجمہ سے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے دو بنانے والوں کے درمیان تقابل ہو رہا ہو جبکہ یہاں پر یہ جملہ بطورِ استدلال بیان ہوا ہے کہ تم سب جانتے ہو کہ سب چیزیں بنانے والا اللہ ہی ہے، کسی دوسرے کا تخلیق میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر بھی اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہو؟ جیسا کہ قرآن میں دوسرے مقامات پر کفّار و مشرکین کی زبان سے کہلوایا گیا کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں اور انھیں اس بات کا اعتراف تھا کہ اللہ ہی زمین و آسمان کا رب ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے "اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ آسمان و زمین کا خالق کون ہے؟ تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ"[13]۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے "اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ کون ہے آسمان و زمین کا خالق اور سورج و چاند کو کام میں لگانے والا کون ہے؟ وہ یہی کہیں گے اللہ"[14]۔ لہٰذا، یہاں پر انھیں معنوں میں ترجمہ زیادہ موزوں ہے کہ کیا تم لوگ جانتے بوجھتے اللہ کا شریک ان کو ٹھہراتے ہو جو تخلیق میں کچھ بھی حصہ نہیں رکھتے۔

فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ میں أَوْدِيَةٌ کا ترجمہ 'ندی نالہ' اور 'نالے' سے کیا گیا۔ اگر 'دریا' سے ترجمہ کیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ کیونکہ نالہ تنگ مفہوم پیش کر رہا ہے اور نالہ سے جھاگ اٹھنے کا تصور کرنا بھی مشکل ہے، جس کی یہاں مثال پیش کی جا رہی ہے۔ کیونکہ قصبوں میں جو ایک آدھ کلو میٹر کے اندر پانی بہتا ہے وہ بھی نالہ ہے جس میں نہ موج ہوتی ہے نہ سیلِ رواں۔ جبکہ دریا کا جو تصوّر ہے وہ بہت وسیع ہے، جیسے دریائے گنگا، دریائے نیل وغیرہ جس میں بہاؤ کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ درختوں کو بھی بہالے جائے اور اس کے نتیجہ میں بلند جھاگ اٹھتے ہیں لیکن کچھ ہی دیر میں فنا ہو جاتے ہیں۔ مودودیؒ نے 'ندی نالہ' سے ترجمہ کیا جو نالہ کے مقابلہ میں وسیع ہے۔ بہر حال أَوْدِيَةٌ کا ترجمہ 'دریا' ہوتا تو بہتر ہوتا۔

اسی طرح حِلْيَةٍ کا زیور اور گہنا سے ترجمہ کیا گیا۔ گہنا، زیور کا معمولی حصہ ہے۔ زیور میں مفہوم وسیع ہے۔

اس تمثیل میں مثال حق و باطل کی ہے، ممثل لہ، پانی اور جھاگ، زیور ساز و سامان اوران پر ابھرنے والے جھاگ اور وجہ تمثیل: بقاء صرف حق کو ہے اور باطل فنا ہونے والا ہے۔

زندگی بعدِ موت کی مثال

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّى إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالاً سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءفَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ كَذَلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لاَ يَخْرُجُ إِلاَّ نَكِدًا كَذَلِكَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ۝ (الاعراف: 57،58)

اور وہی ہے کہ ہوائیں بھیجتا ہے اس کی رحمت کے آگے مژدہ سناتی یہاں تک کہ جب اٹھالائیں بھاری بادل ہم نے اسے کسی مردہ شہر کی طرف چلایا پھر اس سے پانی اتارا پھر اس سے طرح طرح کے پھل نکالے اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے کہیں تم نصیحت مانو، اور جو اچھی زمین ہے اس کا سبزہ اللہ کے حکم سے نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس میں نہیں نکلتا مگر تھوڑا بمشکل ہم یونہی طرح طرح سے آیتیں بیان کرتے ہیں ان کے لیے جو احسان مانیں۔ (احمد رضاؒ)

اور وہ ایسا ہے کہ اپنی بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ خوش کر دیتی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اُٹھا لیتی ہیں، تو ہم اس بادل کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں، پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ یوں ہی ہم مردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم سمجھو۔ اور جو ستھری سرزمین ہوتی ہے اس کی پیداوار تو اللہ کے حکم سے خوب نکلتی ہے، اور جو خراب ہے اس کی پیداوار بہت کم نکلتی ہے، اسی طرح ہم دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو شکر ادا کرتے ہیں۔ (محمد جوناگڑھیؒ)

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لیے ہوئے بھیجتا ہے، پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے، اور وہاں مینہ برسا کر (اُسی

مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے دیکھو، اس طرح ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں، شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا اس طرح ہم نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو شکر گزار ہونے والے ہیں۔ (مودودیؒ)

اور وہی ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوش خبری لانے والی مینھ سے پہلے یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں اُٹھالاتی ہیں بھاری بادلوں کو تو ہانک دیتے ہیں ہم اس بادل کو ایک شہر مردہ کی طرف پھر ہم اُتارتے ہیں اس بادل سے پانی پھر اس سے نکالتے ہیں سب طرح کے پھل، اسی طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تاکہ تم غور کرو، اور جو شہر پاکیزہ ہے اس کا سبزہ نکلتا ہے اس کے رب کے حکم سے، اور جو خراب ہے اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص، یوں پھیر پھیر کر بتلاتے ہیں ہم آیتیں حق ماننے والے لوگوں کو۔ (محمود حسنؒ)

وَهُوَ الَّذِي کا ترجمہ اور وہی ہے کہ، اور وہ اللہ ہی ہے جو، اور وہ ایسا ہے کہ، سے کیا گیا۔ وَهُوَ الَّذِي کا ترجمہ 'اور وہی ہے جو' زیادہ موزوں ہے۔ مودودیؒ نے کی هُوَ کی ضمیر کو کھول کر 'وہ اللہ ہی ہے جو' سے ترجمہ کیا۔ اور جوناگڑھیؒ کے ترجمہ 'وہ ایسا ہے کہ' سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آگے اللہ کی کوئی صفت بیان ہونے جارہی ہو جبکہ یہاں یہ فقرہ بطورِ فاعل آیا ہے۔

البَلدُ المیِّتُ کا ترجمہ مردہ شہر، خشک سرزمین اور مردہ سرزمین سے کیا گیا۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد دوبارہ زندگی بخشنے کی مثال پیش کی ہے۔ ان تینوں ترجموں میں بلحاظِ معنویت زندگی بعدِ موت کے اثبات کی تفہیم کے لئے 'مردہ زمین' مفہوم سے قریب تر ہے۔ عربی لفظ مَیِّتُ بھی اسی معنی کی طرف دلالت کرتا ہے۔ جبکہ بَلدُ کا ترجمہ 'شہر' سے کرنا اس مقام پر موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اردو میں شہر سے پیداوار کا نکلنا نہیں بولا جاتا، شہر سے مراد کھیت یا زمین نہیں لیا جاتا۔ اس لئے البَلدُ المیِّت کا ترجمہ مردہ سر زمین سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شہر محدود ہے اور زمین وسیع ہے۔ احمد رضاؒ نے بھی اسی

سورہ کی آیت نمبر 58 میں البَلَد الطَّیب کا ترجمہ 'اچھی زمین' سے ہی کیا۔ لیکن اس آیت میں البَلدُ کے لئے 'شہر' سے ترجمہ کیا۔

لاَ یَخْرُجُ إِلاَّ نَکِدًا کا ترجمہ اس میں نہیں نکلتا مگر تھوڑا بمشکل، اس کی پیداوار بہت کم نکلتی ہے، اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا، اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص، سے کیا گیا ہے۔ نَکَدَ کے معنی محروم کر دینا، تھوڑا سا دینا ہے [15]۔ نَکَدَ سے مراد وہ تنگی ہے جو خیر (خوشحالی) لانے سے مانع اور رکاوٹ ہو [16]۔ اس آیت میں 'کم پیداوار' کے مقابلہ میں 'ناقص پیداوار' مفہوم سے قریب تر ہے۔ کیونکہ کم پیداوار کچھ تو فائدہ دیتی ہے لیکن ناقص پیداوار میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ اس کو سمجھنے کے لئے تفسیر کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تمثیل کے پیرایہ میں قلبِ مومن و قلبِ کافر کی مثال دی جارہی ہے۔ اس پر تمام مترجمین کا اتفاق ہے۔ اس طرح اگر 'تھوڑی پیداوار' معنوں میں استعمال کریں تو اس سے مراد کافر کے دل پر بھی تھوڑا ایمانی اثر ہونے کا اشارہ ملتا ہے جبکہ ناقص پیداوار سے مراد ان کے دلوں میں جو کھوٹ اور غیض و غضب ہے اس کے ظاہر ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔

مومن کا قلب زرخیز زمین کی طرح ہے جو قرآن کی تعلیمات کو قبول کر کے حُسنِ اخلاق و حُسنِ اعمال کی مثال بن جاتا ہے۔ جبکہ کافر کا دل ان آیات کو قبول تو نہیں کرتا، بلکہ قرآن سُن کر مزید مشتعل ہو جاتا ہے اور اپنے دل کا غیض و غضب نکالتا ہے۔ اس کے لئے ناقص پیداوار اور خاردار جھاڑیاں ہی زیب دیتی ہیں جو انسان کو کچھ نفع تو نہیں دے سکتیں البتہ نقصان ضرور پہنچا سکتیں۔

لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُونَ کا ترجمہ کہیں تم نصیحت مانو، تاکہ تم سمجھو، شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو اور تاکہ تم غور کرو، سے کیا گیا ہے۔ لَعَلَّکُمْ کے لئے 'کہیں تم' یہاں مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اردو میں 'کہیں تم' کا استعمال کسی کام سے بچنے یا احتیاط کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے کہیں بھول نہ جانا، کہیں کھو نہ جانا۔ اس طرح نصیحت لینے کے لئے اُمید کے کلمات جیسے 'شاید کہ' اور 'تاکہ' زیادہ مناسب ہیں۔

لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ کا ترجمہ ان کے لیے جو احسان مانیں،ان لوگوں کے لیے جو قدر کرتے ہیں،ان لوگوں کے لیے جو شکر گزار ہونے والے ہیں اور حق ماننے والے لوگوں کو، سے کیا گیا ہے۔ محمود حسنؒ کا طرزِ ترجمہ اگرچہ لفظی ہے لیکن کبھی کبھی انھوں نے لفظی ترجمہ سے ہٹ کر سیاق کی مناسبت سے مرادی ترجمہ بھی کیا ہے، جیسے یہاں پر لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ کا ترجمہ 'حق ماننے والوں' سے کیا۔

اس مقام پر اگر آیت میں بیان ہونے والے انعامات جیسے (بارش و پیداوار) پر غور کریں تو شکر کرنے والے یا، قدر کرنے والوں' سے ترجمہ کرنا زیادہ موزوں ہے۔اور اگر اس تمثیل میں قلبِ مومن و قلبِ کافر کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس زاویہ سے دیکھیں تو 'حق ماننے والے 'بہتر ترجمانی کر رہا ہے۔

فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَفَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ کے درجِ ذیل تراجم آئے:

پھر اس سے پانی اتارا پھر اس سے طرح طرح کے پھل نکالے، پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں، اور وہاں مینہ برسا کر (اسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے، پھر اتارتے ہیں اس بادل سے پانی پھر اس سے نکالتے ہیں سب طرح کے پھل۔

فَأَخْرَجْنَا بِهِ میں 'ہ' کی ضمیر پانی کی طرف ہے۔ مودودیؒ کے ترجمہ میں ایسا لگ رہا ہے جیسے 'ہ' کی ضمیر کا مرجع زمین ہے۔ جبکہ زمین عربی میں مؤنث استعمال ہوتی ہے۔اور اگر زمین کی طرف اشارہ کرنا ہوتا تو فَأَخْرَجْنَا بِهَا ہوتا۔ اگرچہ مودودیؒ کا طرزِ ترجمہ ترجمانی ہے لیکن جہاں پانی کی طرف اشارہ ہو وہاں ترجمہ پڑھنے سے زمین کا خیال ہونا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے یہاں پر آپ نے '(اسی مردہ زمین)' کا اضافہ اس بات پر زور دینے کے لئے کیا کہ جس طرح مردہ زمین بارش سے جی اُٹھتی ہے اسی طرح تم بھی اُٹھائے جاؤ گے لیکن اس اضافہ سے ضمیر کے اشارہ میں ابہام پیدا ہو گیا۔ اس جگہ محمد جوناگڑھیؒ کا ترجمہ واضح بھی ہے اور جامع بھی۔ جس میں ضمیر کے مرجع (بادل اور پانی) کا ذکر کرنے سے مفہوم میں وضاحت آگئی۔

اس تمثیل میں زندگی بعدِ موت کی مثال پیش کی گئی ہے، ممثل لہ، مردہ و بنجر زمین کا جی اٹھنا، وجہ تمثیل ہے حیات بعدِ موت کا حتمی و یقینی ہونا۔

دُنیوی زندگی کی مثال

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاء أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاء فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (الکہف:45)

اور ان کے سامنے زندگانی دنیا کی کہاوت بیان کرو جیسے ایک پانی ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے سبب زمین کا سبزہ گھنا ہو کر نکلا کہ سوکھی گھاس ہو گیا جسے ہوائیں اڑائیں اور اللہ ہر چیز پر قابو والا ہے۔(احمد رضاؒ)

ان کے سامنے دنیا کی زندگی کی مثال (بھی) بیان کرو جیسے پانی جسے ہم آسمان سے اتارتے ہیں اس سے زمین کا سبزہ ملا جلا (نکلا) ہے، پھر آخر کار وہ چورا چورا ہو جاتا ہے جسے ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔(محمد جوناگڑھیؒ)

اور اے نبیؐ! اِنہیں حیاتِ دنیا کی حقیقت اِس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پَود خُوب گھنی ہو گئی، اور کل وہی نباتات بھُس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔(مودودیؒ)

اور بتلادے ان کو مثل دنیا کی زندگی کی جیسے پانی اتارا ہم نے آسمان سے پھر زلا ملا نکلا اس کی وجہ سے زمین کا سبزہ پھر کل کو ہو گیا چورا چورا ہوا میں اڑتا ہوا، اور اللہ کو ہے ہر چیز پر قدرت۔(محمود حسنؒ)

یہاں پر احمد رضاؒ نے مَثَل کا ترجمہ 'کہاوت' سے اور كَمَاء أَنزَلْنَاهُ میں مَاء کا ترجمہ 'ایک پانی' سے کیا۔ جبکہ پانی کو عدد سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں مَثَل کے لئے مثال یا مثل کا ترجمہ مستعمل ہے جیسا کہ دیگر مترجمین نے کیا ہے۔ کہاوت، مثل سے الگ چیز ہے جس کو انگریزی میں proverb کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بعض مقامات پر مَثَل کا ترجمہ مثال سے بھی کیا ہے جیسے سورۃ الزمر، آیت 29۔ بہر حال ان کے ادبی مقام و مرتبہ کے پیشِ نظر اسے سہوِ کتابت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ کے درج ذیل تراجم سامنے آئے:

تواس کے سبب زمین کا سبزہ گھنا ہو کر نکلا، اس سے زمین کا سبزہ ملا جلا (نکلا) ہے، تو زمین کی پَود خُوب گھنی ہو گئی، پھر زلا ملا نکلا اس کی وجہ سے زمین کا سبزہ۔ مودودیؒ اور احمد رضاؒ نے اخْتَلَطَ بمعنی گھنی اور گھنا سے ترجمہ کیا جو کہ لائقِ ترجیح ہے۔ دراصل اخْتَلَطَ کے لفظی معنی 'ملنا' ہی ہیں[17] لیکن یہ لفظ چونکہ زمین کی پیداوار کے لئے استعمال ہوا ہے اس لئے سیاق کے اعتبار سے 'گھنا سبزہ' یا 'گھنی پود' نسبتاً بلیغ مفہوم پیش کر رہا ہے۔

اس تمثیل میں دنیاوی زندگی کی مثال بیان ہوئی، ممثل لہ، کھیتی، وجہ تمثیل ہے دنیا کی زندگی کا عارضی اور وقتی ہونا۔

مؤمن اور مشرک کی مثال

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر: 29)

اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے ایک غلام میں کئی بد خو آقا شریک اور ایک نرے ایک مولیٰ کا، کیا ان دونوں کا حال ایک سا ہے سب خوبیاں اللہ کو بلکہ ان کے اکثر نہیں جانتے۔ (احمد رضاؒ)

اللہ تعالیٰ مثال بیان فرما رہا ہے ایک وہ شخص جس میں بہت سے باہم ضد رکھنے والے سا جھی ہیں، اور دوسرا وہ شخص جو صرف ایک ہی کا (غلام) ہے، کیا یہ دونوں صفت میں یکساں ہیں، اللہ تعالیٰ ہی کے لئے سب تعریف ہے۔ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔ (محمد جوناگڑھیؒ)

اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک شخص تو وہ ہے جس کی ملکیت میں بہت سے کج خُلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟ الحمدللہ، مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔ (مودودیؒ)

اللہ نے بتلائی ایک مثل ایک مرد ہے کہ اس میں شریک ہیں کئی ضدّی اور ایک مرد ہے پورا ایک شخص کا کیا برابر ہوتی ہیں دونوں مثل سب خوبی اللہ کے لئے ہے پر وہ بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ (محمود حسنؒ)

اس تمثیل میں مؤمن اور مشرک کی حالت بیان کی گئی ہے۔ مؤمن کو ایک آقا کے غلام اور مشرک کو کئی آقاؤں کے غلام سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور دونوں کی حالت کا متضاد ہونا بتایا گیا ہے۔ یہ ایسی مؤثر تمثیل ہے کہ اتنے کم الفاظ میں اس سے زیادہ مؤثر طریقے سے مؤمن اور مشرک کا حال بیان کرنا ناممکن ہے۔

رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ کے درج ذیل تراجم سامنے آئے:

ایک غلام میں کئی بد خو آقا شریک، ایک وہ شخص جس میں بہت سے باہم ضد رکھنے والے ساجھی ہیں، ایک شخص تو وہ ہے جس کی ملکیت میں بہت سے کج خُلق آقا شریک ہیں، ایک مرد ہے کہ اس میں شریک ہیں کئی ضدّی۔ یہاں پر رَجُلاً کا ترجمہ احمد رضاؒ نے 'غلام' سے کیا جو آقا کے بالمقابل میں لایا گیا، اگرچہ اس کا لفظی معنی ایک شخص ہی ہے لیکن اس مقام پر 'غلام' سے ترجمہ کرنا عبارت سے زیادہ میل کھا رہا ہے۔

شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ کا ترجمہ کئی بد خو آقا شریک، باہم ضد رکھنے والے ساجھی، بہت سے کج خلق آقا شریک ہیں اور شریک ہیں کئی ضدّی، سے کیا گیا ہے۔ شکُس کے معنی بخیل ہونا، درشت خو ہونا، سخت مزاج ہونا[18]۔ اور تشاکس کے معنی باہم مخالف ہونا اور ایک دوسرے کی ضد ہونا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو احمد رضاؒ اور مودودیؒ نے اول الذّکر معنی اختیار کیے۔ اور جوناگڑھیؒ اور محمود حسنؒ نے آخر الذّکر۔

عربی متن میں اگرچہ ایسا کوئی لفظ نہیں آیا جس کا اردو متبادل آقا ہو، لیکن عربی میں ترکیبِ عبارت سے مخفی مفہوم واضح ہو جاتا ہے لیکن دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت ان محذوف معنوں کا بھی ترجمہ کرنا پڑتا ہے تاکہ مفہوم آسانی سے سمجھ میں آئے۔

اس مقام پر محمود حسنؒ کا ترجمہ لفظی ہونے کی وجہ سے مفہوم کی ترسیل میں کمزور لگ رہا ہے۔ صرف ترجمہ پڑھنے سے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یہاں مشرک اور مؤحد کی تمثیل بیان ہوئی ہے۔

هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا کے مقابل یہ چار تراجم آئے ہیں: کیا دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟، کیا دونوں کا حال ایک سا ہے، کیا یہ دونوں صفت میں یکساں ہیں، کیا برابر ہوتی ہیں دونوں مثل۔

یہاں محمد جوناگڑھیؒ نے 'دونوں کی صفت' سے ترجمہ کیا اور باقی مترجمین نے 'حالت' سے۔ تمثیل کو تصوّر کے آئینہ میں دیکھا جائے تو مشرک کا حال ایسا ہے کہ وہ متعدد آقاؤں کی تابعداری میں حیران و سرگرداں ہے۔ ایک کو راضی کرنے کی کوشش میں دوسرے کے غضب کا شکار ہے، تو مؤمن ایک ہی آقا کی فرمانبرداری کرتا ہے اور اسی سے استعانت طلب کرتا ہے۔ اور نتیجتاً پُرسکون زندگی گزار رہا ہے۔ اس حیثیت سے دیکھیں تو یہاں پر 'دونوں کا حال' سے ترجمہ کرنا 'دونوں کی صفت' کے مقابلہ میں بہتر معلوم ہو رہا ہے۔

آیت کے آخری حصّہ میں مودودیؒ کے سوا ہر مترجم نے 'الحمدللہ' کا ترجمہ کیا۔ ہے اس مقام پر الحمد للہ کا ترجمہ نہ کرنے سے وقفہ کا احساس پیدا ہوا ہے اور ساتھ ہی خطابت کا اسلوب بھی نمایاں ہو رہا ہے۔ باقی تراجم میں 'الحمدللہ' کا ترجمہ کرنے سے یہ حسن مفقود ہو گیا ہے۔

اس تمثیل میں مؤحد و مشرک کی مثال بیان کی گئی، ممثل لہ، فرد کے مقابل میں جماعت کی غلامی اور وجۂ تمثیل ہے مؤحد اور مشرک کے حال کی حقیقت واضح کرنا۔

شرک کی مثال

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاء كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ۝ (العنکبوت: 41تا43)

ان کی مثال جنہوں نے اللہ کے سوا اور مالک بنا لیے ہیں مکڑی کی طرح ہے، اس نے جالے کا گھر بنایا اور بیشک سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا گھر کیا اچھا ہوتا اگر جانتے۔ اللہ جانتا ہے جس چیز کی اس کے سوا پوجا کرتے

ہیں اور وہی عزت و حکمت والا ہے۔اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں،اور انہیں نہیں سمجھتے مگر علم والے۔(احمد رضاؒ)

جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوااور کارساز مقرر کر رکھے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ بھی ایک گھر بنالیتی ہے، حالانکہ تمام گھروں سے زیادہ بودا گھر مکڑی کا گھر ہی ہے، کاش ! وہ جان لیتے۔اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو جانتا ہے جنہیں وہ اس کے سوا پکار رہے ہیں، وہ زبردست اور ذی حکمت ہے۔ہم ان مثالوں کو لوگوں کے لئے بیان فرمارہے ہیں انہیں صرف علم والے ہی سمجھتے ہیں۔(محمد جوناگڑھیؒ)

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دُوسرے سرپرست بنالیے ہیں اُن کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے کاش یہ لوگ علم رکھتے۔یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو بھی پکارتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے اور وہی زبردست اور حکیم ہے۔یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لیے دیتے ہیں، مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔(مودودیؒ)

مثال ان لوگوں کی جنھوں نے پکڑے اللہ کو چھوڑ کر اور حمائتی جیسے مکڑی کی مثال بنالیا اس نے ایک گھر اور سب گھروں میں بودا سو مکڑی کا گھر اگر ان کو سمجھ ہوتی، اللہ جانتا ہے جس جس کو وہ پکارتے ہیں اس کے سوا کوئی چیز ہو، اور وہ زبردست ہے حکمتوں والا، اور یہ مثالیں بٹھلاتے ہیں ہم لوگوں کے واسطے اور ان کو سمجھتے وہی ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں۔(محمود حسنؒ)

أَوْلِيَاء کا ترجمہ چاروں مترجمین نے اُردو کے مختلف الفاظ مالک، کارساز، سرپرست اور حمائتی سے کیا۔اور یہاں چاروں معنی اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔اس سے عربی الفاظ کی وسعتِ معانی کا پتہ چلتا ہے۔

يَدْعُونَ کا ترجمہ سب نے 'پکارنے' سے کیا جبکہ احمد رضاؒ نے 'پوجا کرتے ہیں' سے ترجمہ کیا۔لفظ پوجا میں مفہوم تنگ ہے۔اس لفظ سے اللہ کے مقابلہ میں صرف بُت پرستی کی قباحت کا تصوّر ذہن میں اُبھرتا ہے۔جبکہ اس مقام پر اللہ کو چھوڑ کر دوسری کسی بھی چیز جیسے پانی، سورج، جن، ملائکہ کو پکارنے کی ممانعت

ہے نہ کہ صرف بُت کی پوجا کی۔ ان کے ترجمہ اور تفسیر دونوں میں صرف بُت پرستی کی قباحت بیان کی گئی ہے۔ نعیم احمدؒ لکھتے ہیں: "تو عاقل کو کب شایان ہے کہ عزّت و حکمت والے قادر مختار کی عبادت چھوڑ کر بے علم و بے اختیار پتھروں کی پوجا کرے۔" جبکہ آیت کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر تمام سہارے کمزور اور ناپائدار ہیں۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہے: "اِس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا دیا، حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے، اور بے جانے بوجھے اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں، حالانکہ وہ پاک اور بالا تر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں"[19]۔ غرض اللہ کو چھوڑ کر جس کو بھی پکارا جائے چاہے وہ بُت ہوں، جن ہوں، فرشتے ہوں یا اللہ کے خاص بندے، تمام ہی اس میں شامل ہیں۔

عربی قواعد کی رو سے بھی دَعَا-یَدعُو، پُکارنا یا بُلانا کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پر معروف معنی کو چھوڑ کر دوسرے معنی اختیار کرنے کے پیچھے کیا حکمت ہے یہ جاننا مشکل ہے۔ بہر حال یَدْعُونَ کا ترجمہ 'پکارنا' سے کرنا ہی موزوں لگ رہا ہے۔

وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ کے لئے درج ذیل تراجم سامنے آئے:

سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا گھر، حالانکہ تمام گھروں سے زیادہ بودا گھر مکڑی کا گھر ہی ہے، اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے، اور سب گھروں میں بودا سو مکڑی کا گھر۔

أَوْهَنَ، اسمِ تفضیل کا صیغہ ہے جس کا مصدر وَھنٌ ہے (بہت کمزور) اس میں تاکید کا پہلو ہوتا ہے۔ 'مکڑی کا گھر ہی ہے' میں 'ہی' کا اضافہ کلام میں زور پیدا کر رہا ہے اور شرک کی نفی بھی اس شدّت سے کر رہا ہے گویا شرک کے تو پیر ہی نہیں ہوتے۔

أَوْهَنَ الْبُيُوتِ کے دو مترادف الفاظ ترجمہ میں آئے ہیں۔ ایک 'کمزور گھر' اور دوسرا 'بودا گھر'۔ ان دونوں میں لفظ 'بودا' زیادہ بلیغ مفہوم پیش کر رہا ہے یعنی اتنا کمزور کہ چھوتے ہی ٹوٹ جائے۔ یہ ترجمہ محمد جوناگڑھیؒ کا ہے۔

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ کا ترجمہ عزّت و حکمت والا، زبردست اور ذی حکمت، زبردست اور حکیم، زبردست ہے حکمتوں والا وغیرہ سے کیا گیا ہے۔ یہاں پر الْعَزِيزُ کا ترجمہ 'عزت والا' لغت کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے لیکن سیاق کے اعتبار سے زبردست یا سب پر غالب زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ یہاں اللہ کو چھوڑ کر دوسرے ساجھی بنانے کی بات ہو رہی ہے۔ وہ سب کمزور ہیں اور اللہ زبردست ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں جہاں بھی اپنی صفات کا ذکر فرماتا ہے اس کا سیاق وسباق سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔

وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ میں عَالِمُونَ کا ترجمہ سوائے محمود حسنؒ کے سب نے 'علم والے' یا 'علم رکھنے والے' سے کیا جبکہ محمود حسنؒ نے 'سمجھ رکھتے ہیں' سے کیا۔ 'سمجھتے وہی ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں' اس وجہ سے جملہ کا حسن بھی ماند پڑ گیا۔ جبکہ دیگر نے علم رکھتے ہیں، علم والے ہیں سے کیا۔ آخر الذکر زیادہ موزوں ہے۔ کیوں کہ معروف معنوں کو چھوڑ کر دوسرے معنی اسی صورت میں لینا بہتر ہے جبکہ معروف معنی عبارت سے میل نہ کھا رہے ہوں۔

اس تمثیل میں مشرکین کی مثال بیان ہوئی، ممثل لہ، مکڑی کا گھر اور وجۂ تمثیل ہے شرک کی قباحت بیان کرنا اور یہ بتانا کہ مشرکین کے تمام سہارے بے فائدہ ہیں۔ ان کی پرستش انسان کو کوئی فائدہ پہنچانے والی نہیں۔

اللہ کے نور کی مثال

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونِةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُّورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاء وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (النور: 35)

اللہ نور ہے آسمانوں اور زمینوں کا، اس کے نور کی مثال ایسی جیسے ایک طاق کہ اس میں چراغ ہے وہ چراغ ایک فانوس میں ہے وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے موتی سا چمکتا روشن ہوتا ہے برکت والے پیڑ زیتون سے جو نہ

پورب کا نہ پچھم کا قریب ہے کہ اس کا تیل بھڑک اٹھے اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے نور پر نور ہے اللہ اپنے نور کی راہ بتاتا ہے جسے چاہتا ہے، اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے، اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

(احمد رضاؒ)

اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اس کے نور کی مثال مثل ایک طاق کے ہے جس میں چراغ ہو اور چراغ شیشہ کی قندیل میں ہو اور شیشہ مثل چمکتے ہوئے روشن ستارے کے ہو وہ چراغ ایک بابرکت درخت زیتون کے تیل سے جلایا جاتا ہو جو درخت نہ مشرقی ہے نہ مغربی خود وہ تیل قریب ہے کہ آپ ہی روشنی دینے لگے اگرچہ اسے آگ نہ بھی چھوئے، نور پر نور، اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے جسے چاہے، لوگوں (کے سمجھانے) کو یہ مثالیں اللہ تعالیٰ بیان فرما رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے حال سے بخوبی واقف ہے۔

(محمد جوناگڑھیؒ)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اِس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں) اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ (مودودیؒ)

اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی مثال اس کی روشنی کی جیسے ایک طاق اس میں ہو ایک چراغ وہ چراغ دھرا ہو ایک شیشہ میں وہ شیشہ ہے جیسے ایک تارہ چمکتا ہوا تیل جلتا ہے اس میں ایک برکت کے درخت کا وہ زیتون ہے نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف، قریب ہے اس کا تیل کہ روشن ہو جائے، اگرچہ نہ لگی ہو اس میں آگ روشنی پر روشنی اللہ راہ دکھلا دیتا ہے اپنی روشنی کی جس کو چاہے، اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے اور اللہ سب چیز کو جانتا ہے۔ (محمود حسنؒ)

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ کے درج ذیل تراجم سامنے آئے:

اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا، اللہ آسمانوں و زمین کا نور ہے، اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا، اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی۔

اس آیت کے مطالعہ میں کسی کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ اللہ کی حقیقت بس نور ہی ہے۔اس آیت کو سمجھنے کے لئے تفسیر کی طرف رجوع کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے۔اس آیت کی تفسیر میں حافظ صلاح الدینؒ لکھتے ہیں:

"یعنی اگر اللہ نہ ہوتا تو نہ آسمان میں نور ہوتا نہ زمین میں۔ نہ آسمان و زمین میں کسی کو ہدایت ہی نصیت ہوتی۔ پس وہ اللہ تعالیٰ ہی آسمان و زمین کو روشن کرنے والا ہے۔اس کی کتاب نور ہے جس کے ذریعہ سے زندگی کی تاریکیوں میں رہنمائی اور روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ حدیث سے بھی اللہ کا نور ہونا ثابت ہے۔وَلَکَ الحَمدُ اَنتَ نُورُ السمٰواتِ وَالارضِ،(حدیث 1120)، پس اللہ کی ذات نور ہے، اس کا حجاب نور ہے اور ہر ظاہری و معنوی نور کا خالق، اس کا عطا کرنے والا اس کی طرف ہدایت کرنے والا صرف ایک اللہ ہے۔"

مودودیؒ کی تفسیر میں اس آیت کی بہتر وضاحت ہے۔ لکھتے ہیں:

"آیت کا یہ فقرہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ 'اس کے نور کی مثال ایسی ہے' اس سے وہ غلط فہمی رفع ہو جاتی ہے جو 'اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے' کے الفاظ سے کسی کو ہو سکتی تھی۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کو نور کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ اس کی حقیقت ہی بس نور ہونا ہے۔ حقیقت میں تو وہ ذاتِ کامل و اکمل ہے جو صاحبِ علم، صاحبِ قدرت، صاحبِ حکمت وغیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ نور بھی ہے۔ لیکن خود اس کو نور محض اس کی کمالِ نورانیت کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ جیسے کسی کے کمالِ فیّاضی کا حال بیان کرنے کے لئے اس کو خود فیض کہہ دیا جائے۔"

نعیم الدین مراد آبادیؒ نے بھی نور کو بطور صفت لیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا جس میں نور بمعنی 'ہادی' ہے۔اہلِ سموات والارض اس کے نور سے ہدایت پاتے ہیں۔

اس تمثیل میں اللہ کے نور کی مثال بیان کی گئی ہے۔ ممثل لہ' طاق میں رکھا ہوا چراغ ہے۔اور وجہ تمثیل راہِ ہدایت کا واضح ہونا ہے۔اس تمثیل میں نور کو ہدایت کے معنوں میں لینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس تمثیل کا ربط آگے بیان ہوئی تمثیل سے بھی ہے جو آیت نمبر 39 میں آئی ہے۔دراصل یہ دونوں تمثیلیں ایک دوسرے کی تکملہ ہیں۔اس زاویہ سے دیکھیں تو اس مثال میں یہ بیان ہے کہ صاف و شفاف تیل اور چمکدار ستارے کی طرح روشن چراغ آپس میں نُورعلیٰ نُور کا کام کر رہے ہیں اور راہ ہدایت کو روشن کر رہے ہیں اور دوسری طرف کفر کی مثال ایسی ہے جیسے کافر سمندر کی تاریک موجوں میں ہے اور اس کے اوپر ایسے بادل ہیں کہ ایک پر ایک ظلمتیں ہیں اس طرح کہ روشنی کا نام و نشان نہیں۔(یہ تمثیل آگے آئے گی)

اس مثال کی تفسیر میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں،ایک تو خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو ساری کائنات میں روشنی کا سبب ہے۔دوسرے،اس تمثیل سے مراد رسول ﷺ کی ذات ہے۔ کسی نے اس سے مراد قرآن کریم کو لیا تو کسی نے قلبِ مؤمن کی نورانیت مراد لی۔ان تمام اقوال پر غور کریں تو ہر صورت میں 'ہدایت' قدرِ مشترک ہے اور تمام معنوں کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔ لیکن تمثیل کے الفاظ پر اگر غور کریں تو یہ تمثیل اللہ کی ذات کے لئے زیادہ چسپاں ہوتی ہے کیونکہ جتنے بھی ہدایت کے ذرائع ہیں چاہے وہ انبیاء ہوں یا آسمانی کتابیں یا ان سے روشنی حاصل کرنے والے،سب کا روشن گر اللہ ہی ہے۔

اس تمثیل میں اللہ کے نور کی مثال بیان کی گئی، ممثل لہ' طاق میں رکھا ہوا روشن چراغ،وجہ تمثیل راہ ہدایت کا واضح ہونا۔

کفّار کے اعمال کی مثال

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاء حَتَّى إِذَا جَاءهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ ۝ (النور: 39،40)

اور جو کافر ہوئے ان کے کام ایسے ہیں جیسے دھوپ میں چمکتا ریتا کسی جنگل میں کہ پیاسا اسے پانی سمجھے، یہاں تک جب اس کے پاس آیا تو اسے کچھ نہ پایا اور اللہ کو اپنے قریب پایا تو اس نے اس کا حساب پورا بھر دیا، اور اللہ جلد حساب کر لیتا ہے۔ یا جیسے اندھیریاں کسی کنڈے کے دریا میں اس کے اوپر موج موج کے اوپر اور موج اس کے اوپر بادل، اندھیرے ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھائی دیتا معلوم نہ ہو اور جسے اللہ نور نہ دے اس کے لیے کہیں نور نہیں۔ (احمد رضاؒ)

اور کافروں کے اعمال مثل اس چمکتی ہوئی ریت کے ہیں جو چٹیل میدان میں ہو جسے پیاسا شخص دور سے پانی سمجھتا ہے لیکن جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو اسے کچھ بھی نہیں پاتا، ہاں اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے جو اس کا حساب پورا پورا چکا دیتا ہے۔ اللہ بہت جلد حساب کر دینے والا ہے۔ یا مثل ان اندھیروں کے ہے جو نہایت گہرے سمندر کی تہ میں ہوں جسے اوپر تلے کی موجوں نے ڈھانپ رکھا ہو، پھر اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں۔ الغرض اندھیریاں ہیں جو اوپر تلے پے در پے ہیں۔ جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی قریب ہے کہ نہ دیکھ سکے اور (بات یہ ہے کہ) جسے اللہ تعالیٰ ہی نور نہ دے اس کے پاس کوئی روشنی نہیں ہوتی۔

(محمد جوناگڑھیؒ)

جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اُس کو پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا، جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔ یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا، کہ

اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اُس پر ایک اور موج، اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے جسے اللہ نور نہ بخشے اُس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔ (مودودیؒ)

اور جو لوگ منکر ہیں ان کے کام جیسے ریت جنگل میں پیاسا جانے اس کو پانی یہاں تک کہ جب پہنچا اس پر اس کو کچھ نہ پایا اور اللہ کو پایا اپنے پاس پھر اس کو پورا پہنچا دیا اس کا لکھا، اور اللہ جلد لینے والا ہے اس کا حساب یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں چڑھی آتی ہے اس پر ایک لہر اس پر ایک اور لہر اس کے اوپر بادل اندھیرے ہیں ایک پر ایک جب نکالے اپنا ہاتھ لگتا نہیں کہ اس کو وہ سوجھے اور جس کو اللہ نے نہ دی روشنی اس کے واسطے کہیں نہیں روشنی۔ (محمود حسنؒ)

كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ کا ترجمہ اس طرح کیا گیا:

دھوپ میں چمکتا ریتا کسی جنگل میں، اس چمکتی ہوئی ریت کے ہیں جو چٹیل میدان میں، دشت بے آب میں سراب، ریت جنگل میں۔ یہاں 'دشت بے آب میں سراب' بڑی خوبصورتی کے ساتھ کم الفاظ میں زیادہ مفہوم پیش کر رہا ہے۔ اور یہ ترجمہ مودودیؒ کا ہے۔ انھوں نے سَرَاب کا ترجمہ سراب ہی سے کیا اور قِيعَةٍ کا ترجمہ 'دشت بے آب' سے، یہ بلیغ ترجمہ ہے اس سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ ایسا صحرا ہے جس میں دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں ہے۔ احمد رضاؒ اور محمود حسنؒ نے قِيعَة کا ترجمہ جنگل سے کیا۔ جبکہ لفظ جنگل یہاں وہ منظر و مفہوم نہیں پیش کر رہا ہے جو مثال میں بیان ہوا ہے۔ جنگل میں ریت کا چمکنا تو نا قابل تصور ہے کیونکہ جنگل میں تو درخت بھی ہوتے ہیں اور گھنا سایہ بھی۔ اصل میں قِيعَة، قَاع کی جمع ہے جس کے معنی چٹیل میدان یا وسیع میدان ہے [20]۔

وَوَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ کے تراجم درجِ ذیل ہیں:

اور اللہ کو اپنے قریب پایا، اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے، اور اللہ کو پایا اپنے پاس، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا۔

عِندَهُ کا ترجمہ عموماً 'اس کے پاس' ہی کیا جاتا ہے لیکن اس مثال میں 'وہاں اللہ کو موجود پایا' سے ترجمہ کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لفظ پاس میں کسی سے بہت قریب ہونے کا مفہوم ہے، جبکہ یہاں جو کافر کا حال بیان ہو رہا ہے وہ اس طرح ہے کہ کفار دنیا میں جو بھی اعمال کرتے ہیں اور اس کے اچھے نتائج کی توقع رکھتے ہیں وہ انھیں کبھی ملنے والے نہیں ہیں۔ اسکے بر خلاف وہ جس اللہ کا ساری زندگی انکار کرتا رہا اور مرنے کے بعد جس مقام پر وہ پہنچا وہاں اللہ کو اس کا حساب لینے کے لیے موجود پایا نہ کہ اپنے پاس یا قریب پایا۔

فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ کے لیے کسی کنڈے کے دریا، گہرے دریا، اور سمندر کے الفاظ ترجمہ میں آئے ہیں۔ دراصل شمالی ہند میں سمندر کو دریا بھی کہتے ہیں اس لحاظ سے مودودیؒ کے سوا سبھی مترجمین نے 'دریا' سے ترجمہ کیا جو ان کے محاورہ کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ اس کو ترجمہ پر علاقائی اثر کہہ سکتے ہیں۔ سمندر میں دریا کے مقابلہ میں وسعت پائی جاتی ہے۔ سمندر دریا سے اس طرح مختلف ہے کہ ایک سمندر میں کئی دریا ملتے ہیں۔ یہاں مودودیؒ نے بَحْر کا سمندر سے ترجمہ کیا۔

وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ کا ترجمہ اور اللہ جلد حساب کر لیتا ہے، اللہ بہت جلد حساب کر دینے والا ہے، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی، اور اللہ جلد لینے والا ہے اس کا حساب، سے کیا گیا۔ محمود حسنؒ کے ترجمہ میں لفظ 'اس کا' زائد ہے کیونکہ یہاں کسی خاص شخص کے حساب لینے کا ذکر نہیں بلکہ یہ جملہ اللہ کی صفتِ دائمہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

اس تمثیل میں کافر کے اعمال کی مثال بیان ہوئی، ممثل لہ، سراب اور سمندر کے اندھیرے اور وجہِ تمثیل ہے کافروں کے اعمال کا بے وزن اور بے اثر ہونا یا نتیجہ خیز نہ ہونا۔

حوالہ جات

[1] ڈاکٹر ذوالفقار کاظم، قرآن حکیم انسائیکلوپیڈیا، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2006ء، ص 301

[2] الاعراف: 57

[3] العنکبوت: 41

[4] ابراھیم: 18

[5] اختر حجازی، تمثیلاتِ قرآنی، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 1982ء، ص 9

[6] النور: 35

[7] الصّافّات: 49

[8] الاعراف: 176

[9] لقمان: 19

[10] انجینئر عبدالحکیم ملک، منشورِ قرآن، اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن، پاکستان، 2007ء، ص 1141

[11] امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبیؒ، تفسیر قرطبیؒ، ضیاء القرآن پبلیکیشنز (لاہور)، 2012ء، جلد اوّل، ص 228

[12] نعیم الدین مراد آبادیؒ، تفسیر کنزالایمان، حفیظ بک ڈپو (دہلی)، ص 363

[13] لقمان: 25

[14] العنکبوت: 61

[15] لوئیس معلوف، ترجمہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، المنجد، مکتبہ قدوسیہ (لاہور)، 2009ء، ص 925

[16] امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبیؒ، تفسیر قرطبیؒ، ضیاء القرآن پبلیکیشنز (لاہور)، 2012ء، جلد چہارم، ص 276

[17] لوئیس معلوف، ترجمہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، المنجد، مکتبہ قدوسیہ (لاہور)، 2009ء، ص 217

[18] لوئیس معلوف، ترجمہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، المنجد، مکتبہ قدوسیہ (لاہور)، 2009ء، ص 441

[19] الانعام:100

[20] سید فضل الرحمٰن، معجم القرآن، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، 1984ء، ص 371

باب پنجم

آیاتِ انفس و آفاق کے تراجم کا تقابلی مطالعہ

تمہید

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے انسانوں کی ہدایت کے لئے مختلف قسم کے وسائل کا انتخاب فرمایا چنانچہ آنکھیں کھول دینے اور بصیرتوں کو وا کر دینے کا ایک واضح طریقہ یہ اپنایا کہ انسانوں کو قرآن میں مختلف کائناتی نشانیاں بیان کر کے ،اپنی مخلوق و کاریگری پر تدبّر کرنے پر اُکسایا۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فطرت کے مظاہر اور نفوس میں پوشیدہ رازوں کی طرف انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے۔قرآن میں 50 سے زائد آیات میں غور وتدبّر کرنے اور عقل و فکر استعمال کرنے پر اکسایا گیا[1]۔اور 750 دفعہ مسلمانوں کی توجہ سائنسی حقائق اور مشاہدات کی طرف مبذول کرائی گئی ہے[2]۔

اس موضوع کے تحت ہم ایسی چند آیات کے اُردو تراجم کا تجزیہ تقابلی مطالعہ کے ذریعہ پیش کریں گے جن میں فطرت کے نو منکشف رازوں کی طرف واضح اشارے یا نشانیاں ملتی ہیں جن تک انسان کی رسائی جدید علمی ترقیات کے بعد ہو سکی ہے۔ان معلومات کو ہم جدید سائنسی مطالعہ میں مختلف عناوین کے تحت پڑھتے ہیں۔ یہاں پر ان موضوعات (جیسے کائنات کا ارتقاء،انسانی تخلیق کے مراحل،بحریات وغیرہ) کے تحت چند آیات کا انتخاب صرف زمرہ بندی کی سہولت کی خاطر کیا گیا ہے۔اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں نے قرآنی آیات کو سائنسی عناوین دئے ہیں۔

قرآن اور سائنس سے متعلق جب بھی گفتگو ہو تو چند اہم باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

1۔قرآن مجید میں سائنسی دلچسپی کے واقعات یا سائنسی خبریں موجود ہیں لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے اس کی ہر آیت میں علمی و سائنسی تعبیریں بیان کرنا اور اس کتاب

کو غیر ضروری بحثوں میں اُلجھادینا اس کے نزول کے منشا کے خلاف ہے۔ بعض لوگ قرآن کو کتابِ ہدایت کے بجائے کتابِ علوم کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو غیر مناسب ہے۔

2۔ قرآن اور سائنس میں مکمل ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ان دو علوم میں کچھ مناسبتوں کے باوجود بعض پہلوؤں کے اعتبار سے نمایاں فرق ہے۔

قرآن اور سائنس علم کے دو الگ الگ سر چشمے ہیں۔ قرآن، علیم و خبیر ہستی اللہ کا کلام ہے جو انسانوں کی طرف انسانی زبان ہی میں نازل کیا گی البتہ الفاظ کا انتخاب اور جملوں کی ترکیب اللہ نے اختیار فرمائی۔ یہ مکمل، غیر متبدل اور زندہ جاوید ہے۔ جبکہ سائنس ملحدانہ علم ہے جسے انسان نے اپنی زبان میں واضح کیا۔ یہ متبدل ہے۔

ان دو علوم کے مقاصد میں بھی واضح فرق ہے۔ قرآن کے نزدیک کائنات کی تفہیم کا مقصد عبرت ہے جبکہ سائنس کے نزدیک کائنات کی تفہیم کا مقصد اقتدار ہے۔ قرآن کے نزدیک کائنات کی تفہیم کا مدّعا اطاعت و نیابتِ الٰہی اور معرفتِ حق ہے جس کے نتیجے میں دنیوی فلاح کا وعدہ کیا جاتا ہے اور اُخروی فلاح کی ضمانت دی جاتی ہے۔ سائنس کے نزدیک کائنات کی تفہیم کا مدّعا تسخیرِ کائنات ہے جس کے نتیجے میں دنیوی فائدوں کی ہی اُمید کی جاسکتی ہے[3]۔

قرآن کا تصورِ علم سائنس سے مختلف ہے۔ یہ محسوسات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قرآنی آیات سائنس سے بلند تر ہے۔ قرآن کی کسی آیت کو سائنسی کہنا اس کے مرتبے کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ سائنس کے باضابطہ محدود معنی یہ ہیں کہ فطرت اور عالمِ طبعی کا وہ منظّم علم جو مشاہدہ، تجربہ اور پیمائش سے ماخوذ ہو سائنس کہلاتا ہے۔ اور کسی بھی قول کی سائنسیت کو جانچنے کے لئے توثیق شدہ علمی معیارات یہ ہیں:

1۔ قابلِ تصدیق ہونا، قابلِ معائنہ ہونا (آلات کے ذریعہ) یا قابلِ تکذیب ہونا۔

2۔ تصدیق شدہ ہونا[4]۔

مندرجہ بالا تعریف کے لحاظ سے قرآن کے غیبی اُمور غیر سائنسی ہیں کیونکہ مشاہدہ اور تجربہ سے مبرّاء ہیں۔اور سائنسی مناہج واصول سے ناقابل تصدیق ہیں۔البتہ عالم مشاہدہ سے متعلق قرآن کے جزئی اقوال کی سائنسی مناہج سے تصدیق ہو جاتی ہے۔اس صورت میں انھیں سائنسی کہا جاتا ہے لیکن قرآن کی کسی آیت کو مکمل طور پر سائنسی نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ سائنس کا مزاج ماورائے طبعی کو نہیں مانتا۔قرآن کی ہر آیت میں جزوی طور پر سائنسی حقائق یا نشانی کے ساتھ اللہ کے ہستی کا،اس کی خلاّقی وربوبیت کا یا آخرت کا لازماً ذکر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ فاعل کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔مثال کے طور پر

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ۝وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ۝وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ۝وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۝ (الانبیاء:30تا33)

کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبیؐ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے اِنہیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا، مگر یہ ہیں کہ اس کی نشانیوں کی طرف توجّہ ہی نہیں کرتے اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سُورج اور چاند کو پیدا کیا سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔

ان آیات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل کی حیثیت سے موجود ہے جیسے "زمین و آسمان کو ہم نے جدا کیا"، "آسمان کو محفوظ چھت ہم نے ہی بنایا"، "وہی ہے جس نے رات دن، سورج اور چاند بنائے" وغیرہ۔اور لفظ 'اللہ' ہی سائنس کے مزاج کے اعتبار سے غیر سائنسی ہے۔لہٰذا قرآن کی کوئی

بھی آیت موجودہ سائنس کی تعریف کے اعتبار سے کُلی طور پر سائنسی نہیں بلکہ جزوی طور پر ہے۔البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں فطرت کے راز یا سائنسی حقائق کے واضح اشارے موجود ہیں۔

عاقل اور غیر عاقل کی تمیز قرآن اور سائنس میں بالکل اُلٹ ہے۔دونوں ایک دوسرے کی ضد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔قرآن کے مطابق عاقل وہ ہیں جن کے لیے فطرت کے محسوس پہلو توحید،اللہ کی تمام صفات اور آخرت کے لیے نشانی بن جاتے ہیں۔وحی کی سچائیوں کا انکار کرنے والے اور ایمان قبول نہ کرنے والے قرآن کے نزدیک غیر عاقل ہیں جبکہ سائنس میں وحی کو تسلیم کرنے اور ایمان لانے والا غیر عاقل کہلاتا ہے۔سائنس محسوسات میں مقید ہے محسوسات سے آگے بڑھ جانے والوں کو ناعقل تصور کرتی ہے۔بہر حال قرآن کا تصور عقل بھی محسوسات سے بلند ہے[5]۔

قرآن وسائنس کا تعلق

جب قرآن اور سائنس میں تضاد ہے تو ہم کیوں سائنسی حقائق کو قرآن کے تناظر میں دیکھنا چاہتے ہیں؟ بے شک قرآن کریم نہ ہی سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی اس کی آیات سائنسیت کے روایتی تصور کی پابند ہیں۔اس کے باوجود قرآن میں سائنسی دلچسپی کے معاملے اور خبریں موجود ہیں۔

قرآن میں سائنس کا استدلالی پہلو ہے۔سائنس کی توضیح یا تفہیم بیان کرنا کتاب اللہ کا کام نہیں ہے یہ بنیادی طور پر کتابِ ہدایت ہے البتہ جتنی بھی آیات میں سائنسی حقائق کا ذکر ملتا ہے ان کی عصری سائنس کسی بھی دور میں تکذیب نہیں کر سکی اور نہ ہی کر سکے گی۔ثابت شدہ سائنس قرآن کی توثیق ہی کرتی ہے اور قرآن کو مزید گہرائی سے سمجھنے میں معاون ہوتی ہے۔

قرآنی آیات کی سائنسی توضیح کا فائدہ

1۔یہ توضیحات قرآن کے وجوہِ اعجاز میں اور اعجاز کے معنوں میں اضافہ کرتے ہیں یا نئے پہلو عطا کرتے ہیں۔کائنات میں ایسے پوشیدہ راز ہیں جن کے انکشاف سے قبل ان رازوں کی طرف قرآنی اشاروں کا

سمجھنا ناممکن ہے۔اور قرآن میں ایسے اعجاز ہیں جن تک عقل کی رسائی کائنات کے مستور اسرار و حقائق کے انکشاف کے بعد ہی ہو سکتی ہے[6]۔

2۔قرآن کی بہت سی آیات سائنسی توضیح کے بعد اپنے مفہوم میں نئی گہرائی فراہم کرتی ہے اس گہرائی تک نزول قرآن کے وقت کوئی شخص فہم کامل کے ساتھ رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا[7]۔

نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق قرآن کریم ایسی کتاب ہے جس کا علماء جتنا بھی مطالعہ کریں کبھی سیر اب نہیں ہو سکتے۔حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی ﷺ نے قرآن کا تعارف پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"خبر دار رہنا! عنقریب فتنے اٹھیں گے۔میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ان سے بچا کیسے جا سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی کتاب سے۔جس میں تم سے پہلے جو کچھ ہوا اس کی خبریں ہیں اور جو بعد میں ہو گا اس کی بھی اطلاعات ہیں، جو تمہارے مابین اختلاف ہو گا اس کا فیصلہ بھی ہے۔یہ فیصل کتاب ہے مذاق و ٹھٹھہ نہیں ہے۔جو مغرور اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اسے توڑ کر رکھ دے گا۔جس نے اس کے علاوہ کہیں اور سے راہنمائی لی اسے اللہ بھٹکا دے گا۔یہ قرآن اللہ کی بڑی مضبوط رسی ہے اور بڑا حکیمانہ ذکر ہے۔یہی صراط مستقیم ہے۔یہی قرآن ہے جس سے خواہشات کبھی نہیں بہکتیں نہ ہی زبانیں لڑکھڑاتی ہیں، علماء اس سے کبھی سیر اب نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ بار بار پڑھنے سے پرانا لگتا ہے۔اس کے عجائب نہ ختم ہونے والے ہیں۔یہ وہی قرآن ہے جسے سن کر جن نہ رک سکے اور پکار اٹھے: بلاشبہ ہم نے بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو راستی کی طرف راہنمائی کرتا ہے ہم اس پر ایمان لائے (سورۃ الجن) جس نے اس قرآن کے مطابق بات کہی اس نے سچ کہا اور جس نے اس کے کہے پر عمل کیا اس نے اجر پایا اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ دیا اس نے انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف بلایا اسے صراط مستقیم کی راہ دکھا دی گئی[8]۔

سائنسی حقائق (یا فطرت کے نو منکشف حقائق) کی روشنی میں قرآن پر تدبّر کرنے سے اس کا وحی الٰہی ہونے کا یقین گہرا ہوتا ہے جو قرآن کے وحی الٰہی ہونے کے بہت سے شواہد میں سے ایک شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔اور ایسے ذہنوں کے لئے حق کی راہیں کھول دیتا ہے جو جدید افکار یا سائنسیت سے مرعوب ہیں۔

آیاتِ کائنات میں تدبّر سے خشیت کا مقام حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی ایمان میں اضافہ اور اطمینانِ قلب کا موجب بھی بنتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے ایمان اور یقین ہونے کے باوجود اطمینانِ قلب کے لئے مردوں کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کروانے کی اللہ سے استدعا کی تھی۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَى وَلَكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (البقرہ،260)

اور جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ: "میرے مالک، مجھے دکھادے، تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے" فرمایا: "کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" اُس نے عرض کیا "ایمان تو رکھتا ہوں، مگر دل کا اطمینان درکار ہے" فرمایا: "اچھا تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے خوب جان لے کہ اللہ نہایت بااقتدار اور حکیم ہے"۔

دعوتِ غور و فکر

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فطرت کے مظاہر اور نفوس میں پوشیدہ رازوں کی طرف انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُوْلِي الأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىَ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (سورہ آل عمران، آیت 191،192)

زمین و آسمان کی پیدائش میں اور رات و دن کے باری باری آنے میں ان ہوشمندوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

مذکورہ بالا آیت میں غور و فکر کرنے والوں کا دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگنا قابلِ غور ہے۔ جو یہاں اس بات کی طرف دلالت کرتا ہے کہ اولوالباب وہ ہیں جو محسوس حقائق میں تدبر کے ذریعہ غیر محسوس حقائق کو پالیتے ہیں۔

قرآن میں سائنسی حقائق بیان کرنے کا مقصد

فطرت سے متعلق قرآن کی تمام آیات کا مقصد دراصل توحید، رسالت اور آخرت پر استدلال کرنا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت غیر سائنسی عقائد ہیں جن کے حق ہونے پر قرآن، آیاتِ کائنات سے استدلال کرتا ہے۔

أَوَلَمْ يَنظُرُواْ فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّهُ مِن شَيْءٍ وَأَنْ عَسَى أَن يَكُونَ قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ (الاعراف:185)

کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟ اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید اِن کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آلگا ہو؟ پھر آخر پیغمبرؐ کی اِس تنبیہ کے بعد اور کونسی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟۔

اللّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الأَمْرَ يُفَصِّلُ الآيَاتِ لَعَلَّكُم بِلِقَاء رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ(الرعد:2)

وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں، پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا، اور اُس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا اِس سارے نظام کی ہر چیز ایک

وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے اور اللہ ہی اِس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے، شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الأَمْرَ مَا مِن شَفِيعٍ إِلاَّ مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ذَلِكُمُ اللّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَفَلاَ تَذَكَّرُونَ (یونس:3)

حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تخت حکومت پر جلوہ گر ہوا اور کائنات کا انتظام چلا رہا ہے کوئی شفاعت (سفارش) کرنے والا نہیں اِلّا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے یہی اللہ تمہارا رب ہے لہٰذا تم اُسی کی عبادت کرو پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے ؟۔

قرآن اللہ کی عجیب و غریب خلاقی و کاریگری میں غور و فکر کے ذریعہ بھی کتابِ ہدایت ہے۔ قرآن میں صاحبِ بصیرت لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے آیاتِ انفس و آفاق پر تدبر پر اُکسایا گیا۔ مختلف کائناتی نشانیاں بیان کرنے کے پیچھے یہی مقصد و حکمت کارفرما نظر آتی ہے۔

قرآن اور سائنس پر تقابلی گفتگو سے قبل ہم اپنا موقف واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس موضوع کے تحت صرف سائنسی حقائق پر گفتگو ہو گی۔ سائنسی حقائق سے مراد ثابت شدہ سائنس ہے جس پر ابتداء سے لے کر آج تک ہر سائنسدان متفق ہو۔ سائنسی نظریات و مفروضات سے متعلق کوئی بحث شامل نہیں ہو گی۔

تقابلی جائزہ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

کائنات کاارتقاء

ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاء وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ اِئْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ۝فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَى فِي كُلِّ سَمَاء أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَاء الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ۝(حٰمٓ السجدہ: 11،12)

پھر آسمان کی طرف قصد فرمایااور وہ دھواں تھا تواس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں حاضر ہو خوشی سے چاہے ناخوشی سے، دونوں نے عرض کی کہ ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوئے۔ توانہیں پورے سات آسمان کر دیادو دن میں اور ہر آسمان میں اسی کے کام کے احکام بھیجے اور ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا اور نگہبانی کے لیے یہ اس عزت والے علم والے کا ٹھہرایاہوا ہے۔(احمد رضاؒ)

پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوااور وہ دھواں (سا) تھا پس اسے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے۔ دونوں نے عرض کیا ہم بخوشی حاضر ہیں۔ پس دو دن میں سات آسمان بنادئے اور ہر آسمان میں اس کے مناسب احکام کی وحی بھیج دی اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت دی اور نگہبانی کی، یہ تدبیر اللہ غالب ودانا کی ہے۔(محمد جوناگڑھیؒ)

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اُس وقت محض دھواں تھا اُس نے آسمان اور زمین سے کہا وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو'' دونوں نے کہا''ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح۔ تب اُس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنادیے، اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیااور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیااور اسے خوب محفوظ کر دیا یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔(مودودیؒ)

پھر چڑھا آسمان کواور وہ دھواں ہو رہا تھا پھر کہا اس کو اور زمین کو آؤ تم دونوں خوشی یا زور سے وہ بولے ہم آئے خوشی سے۔ پھر کر دئے وہ سات آسمان دو دن میں اور اُتارا ہر آسمان میں حکم اُس کا اور رونق دی ہم نے سب سے در لے آسمان کو چراغوں سے اور محفوظ کر دیا یہ سادھا ہوا ہے زبردست خبردار کا۔(محمود حسنؒ)

ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ کا ترجمہ پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا، پھر چڑھا آسمان کو، سے کیا گیا۔ اسْتَوَى کا مادہ س۔و۔ی ہے۔ اگر لغت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اسْتَوَى کے ساتھ جب إِلىٰ آئے تو ارادہ یا قصد کرنے کے مفہوم میں آتا ہے جیسے اسْتَوَى الىٰ شئ کا مطلب قصد و ارادہ کرنا[9] چنانچہ قصد یا ارادہ سے ترجمہ کرنا یہاں صحیح معلوم ہوتا ہے۔ 'متوجہ ہونا' بھی اسی کا ہم معنی ہے۔ اور کلام کی سلاست اور اُردو محاورہ کے اعتبار سے بھی آسمان کی طرف قصد کرنے کے مقابلہ میں آسمان کی طرف متوجہ ہونا زیادہ بلیغ مفہوم پیش کر رہا ہے اگرچہ دونوں مناسب ہیں۔

محمود حسنؒ نے اس فقرہ کا ترجمہ 'پھر چڑھا آسمان کو' سے کیا۔ 'آسمان کو چڑھنا' اور 'آسمان کی طرف متوجہ ہونا' میں معنوی اعتبار سے بنیادی فرق ہے۔ پہلے فقرہ میں آسمان کے پہلے سے وجود ہونے کا احتمال ہوتا ہے جبکہ دوسرے میں آسمان بنانے یعنی وجود میں لانے کی طرف متوجہ ہونے کا مفہوم نکلتا ہے۔ اور یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔ اس لئے کہ وَهِيَ دُخَانٌ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض دھواں تھا یعنی ابھی پوری طرح وجود میں نہیں آیا تھا۔

محمود حسنؒ نے وَهِيَ دُخَانٌ کا بھی ترجمہ 'دھواں ہو رہا تھا' سے کیا۔ جس سے اس کے وجود سے قبل کی کیفیت نہیں بلکہ وقتیہ طور پر دھویں میں تبدیل ہونے کا مفہوم نکلتا ہے۔ اس ترجمہ سے ذہن میں ایک ایسا تصور اُبھرتا ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ آسمان پر چڑھ رہا تھا اس اثناء میں آسمان دھواں ہو رہا تھا جو صحیح مفہوم پیش کرنے میں کمزور معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں تجسیم کے اثرات نمایاں ہو رہے ہیں۔

احمد رضاؒ نے ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ کا ترجمہ اس طرح کیا: پھر قصد کیا آسمان کی طرف، سو ٹھیک کر دیا ان کو سات آسمان۔ یہاں بھی توجہ کے معنوں میں ہی آیا ہے کیونکہ اس کے بعد اسے سات آسمان بنانے کا ذکر ہے۔ اس آیت سے بھی متوجہ ہونے کے مفہوم کو تقویت ملتی ہے۔ تخلیق سے قبل جب آسمان تھا ہی نہیں تو اس پر چڑھنے کی بات نا قابل فہم ہے۔

اِئْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا کا ترجمہ تم دونوں حاضر ہو خوشی سے چاہے ناخوشی سے، تم دونوں خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے، آؤ تم دونوں خوشی سے یا زور سے، سے کیا گیا جبکہ مودودیؒ نے اس کا مرادی ترجمہ کیا۔ لکھتے ہیں 'وجود میں آجاؤ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو'۔ اِئْتِيَا کا لفظی ترجمہ 'آنے' سے کرنے کے بعد اس کی تفہیم کی ضرورت باقی رہتی ہے جسے مترجمین نے تفسیر میں واضح کیا۔ تفسیر معارف القرآن میں 'خوشی یا ناخوشی سے آنے' کا مطلب اللہ کے احکام کی اطاعت کرنا لیا ہے اور انھوں نے اس سے جو احکام مراد لئے وہ آسمان کا سات آسمان میں بدلنا اور زمین میں قیامت تک ہونے والے تغیرات ہیں۔ ان پر اگر ذرا سا غور کیا جائے تو بات وہی بنتی ہے کہ آسمان و زمین کو موجودہ شکل میں وجود میں آنے کا حکم ہوا۔

آیتِ مذکورہ میں أَمْرَهَا کا ترجمہ 'اس کا حکم' اور 'اس کا قانون' سے کیا گیا۔ جنھوں نے اس کا ترجمہ احکام سے کیا اس سے مراد آسمانوں میں آباد فرشتوں کو مخصوص کاموں، اطاعت اور عبادت کے پابند بنانے کے مفہوم میں لیا۔ اس کا ترجمہ قانون سے کرنے میں مفہوم زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں اطاعت اور عبادت کے ساتھ ساتھ وہ ساری قوتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جن اصولوں پر یہ کائنات چل رہی ہے جیسے بارش اور ہواؤں کے چلنے کے قوانین، اس کے علاوہ مقناطیسی قوتیں، مرکز جو اور مرکز گریز قوتیں، قوتِ کشش وغیرہ۔

وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا کے دو مفہوم سامنے آئے۔ ایک یہ کہ آسمان کو خوب محفوظ بنایا اور دوسرا ستاروں کے ذریعہ آسمان کی حفاظت کی۔ پہلے مفہوم کو محمود حسنؒ اور مودودیؒ نے اختیار کیا جبکہ دوسرا مفہوم احمد رضاؒ اور جوناگڑھیؒ نے لیا۔ ستاروں سے نگہبانی کرنے سے مراد آسمان کی شیاطین کے داخلہ سے حفاظت کے معنوں میں لیا ہے۔

پہلے مفہوم کی تائید وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا۔۔۔الخ[10] اور اللّٰهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ۔۔۔الخ[11] سے ہوتی ہے۔ اور دوسرے مفہوم کی تائید وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ۔۔۔الخ[12] اور وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ

فَوَجَدْنَاهَاالخ[13] سے ہوتی ہے۔اس مقام پر تخلیقِ کائنات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو پہلا مفہوم قریب تر ہے۔ جسکی تائید درج ذیل آیت سے ہوتی ہے،

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَيُمْسِكُ السَّمَاء أَن تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ[14]۔

کیاتم دیکھتے نہیں ہو کہ اُس نے وہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے،اوراسی نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایاہے کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے،اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے کہ اس کے اِذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا؟ واقعہ یہ ہے کہ اللہ لوگوں کے حق میں بڑا شفیق اور رحیم ہے۔

ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ کا ترجمہ یہ اس عزت والے علم والے کا ٹھہرایا ہوا ہے، یہ تدبیر اللہ غالب و دانا کی ہے، یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے اور یہ سادھا ہوا ہے زبردست خبر دار کا، سے کیا گیا ہے۔ یہاں زبردست علیم ہستی کا منصوبہ یا غالب و دانا کی تدبیر سیاقِ کلام سے زیادہ میل کھا رہی ہے کیونکہ یہاں اللہ کی قدرت اور اس کی عظمت کے اظہار کا بیان ہے۔ عزت والا اگرچہ لغوی اعتبار سے درست ہے لیکن یہاں پر اللہ کی عزت کے مقابلہ میں عظیم الشان طاقت کا اظہار کیا جارہا ہے۔

اس آیت میں جو سائنسی پہلو عصرِ حاضر کا انکشاف ہے وہ ہے کائنات کی ابتدائی کیفیت کا سحابیہ (nubella) کی شکل میں ہونا۔ قرآن میں اس کے لئے دخان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد پوری کائنات ہے۔

پہاڑوں کی ساخت

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاء لِّلسَّائِلِينَ ۝

(حٰمٓ السجدہ:9،10)

تم فرماؤ کیا تم لوگ اس کا انکار رکھتے ہو جس نے دو دن میں زمین بنائی اور اس کے ہمسر ٹھہراتے رہو وہ ہے سارے جہان کا رب اور اس میں اس کے اوپر سے لنگر ڈالے (بھاری بوجھ رکھے) اور اس میں برکت رکھی اور اس میں اس کے بسنے والوں کی روزیاں مقرر کیں یہ سب ملا کر چار دن میں ٹھیک جواب پوچھنے والوں کو۔(احمد رضاؒ)

آپ کہہ دیجئے! کہ کیا تم اس (اللہ) کا انکار کرتے ہو اور تم اس کے شریک مقرر کرتے ہے جس نے دو دن میں زمین پیدا کر دی، سارے جہانوں کا پروردگار وہی ہے۔اور اس نے زمین میں اس کے اوپر سے پہاڑ گاڑ دئے اور اس میں برکت رکھ دی اور اس میں (رہنے والوں کی) غذاؤں کی تجویز بھی اسی میں کر دی (صرف) چار دن میں، ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر۔(محمد جوناگڑھیؒ)

اے نبیؐ! اِن سے کہو، کیا تم اُس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اُس کا ہمسر ٹھیراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے۔اُس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔(مودودیؒ)

تو کہہ کیا تم منکر ہو اُس سے جس نے بنائی زمین دو دن میں اور برابر کرتے ہو اس کے ساتھ اوروں کو وہ ہے رب جہان کا اور رکھے اس میں بھاری پہاڑ اوپر سے اور برکت رکھی اس کے اندر اور ٹھہرائیں اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں پورا ہوا پوچھنے والوں کو (محمود حسنؒ)

اس آیت میں وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا کا ترجمہ توجہ طلب ہے۔

اور اس میں اس کے اوپر سے لنگر ڈالے (بھاری بوجھ رکھے)، اور اس نے زمین میں اس کے اوپر سے پہاڑ گاڑ دئے، اُس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے، اور رکھے اس میں بھاری پہاڑ اوپر سے۔

پہاڑوں کی ساخت کی حقیقت سامنے آنے کے بعد اس فقرہ کی اہمیت و اعجاز اور بھی نمایاں ہو گیا ہے۔ علمِ ارضیات کی رو سے آج یہ ایک مشہور حقیقت ہے کہ پہاڑوں کی ساخت ایسی ہے کہ زمین کی سطح کے نیچے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسری ارضیاتی ساختوں میں کافی گہرائی تک ان کی جڑیں ہیں۔ اور یہ پہاڑ زمین کی سطح پر ہلکی تشکیل اور سمندوروں کے پیندوں میں بھاری تشکیل کے درمیان مساوی سکونی توازن برقرار رکھتے ہیں جسے Isostatic Balance کہا جاتا ہے[15]۔

جدید معلومات کے مطابق طویل پہاڑی سلسلے زمین میں میخوں کی طرح پیوست ہیں۔ یہ زیرِ زمین تقریباً 80 میٹر گہرائی تک دھنسے ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کی روشنی میں میخوں یا لنگر سے ترجمہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ کے انتخاب میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اور ساتھ ہی اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مکمل مفہوم ترجمہ میں برتنا کتنا مشکل ہے اور کتنی معلومات کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس طرح رَوَاسِيَ میں لنگر ڈالنے کا مفہوم ہے جو احمد رضاؒ کے ترجمہ میں ملتا ہے اور اس لنگر سے مراد پہاڑ ہیں جس کا ذکر باقی مترجمین نے کیا۔

پہاڑ جما دینے میں اور رکھ دینے میں وہ فہم نہیں ہے جو لنگر ڈالنے میں یا گاڑ دینے میں ہے۔ پہلے معنوں میں مودودیؒ اور محمود حسنؒ نے ترجمہ کیا جبکہ احمد رضاؒ اور جوناگڑھیؒ نے دوسرے معنوں میں۔ یہاں دوسرے معنی زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ جتنے پہاڑ اوپر سے نظر آتے ہیں اس کی جڑیں زمین میں بھی اسی مناسبت سے پیوست ہیں اور لفظ لنگر ڈالنے میں وہ پورا مفہوم ہے جس میں اوپر سے پھینکنے کے عمل کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن میں پہاڑوں کی تخلیق سے متعلق جتنے مقامات پر بھی تذکرہ ملتا ہےاور رَوَاسِيَ کے علاوہ دوسرے الفاظ ملتے ہیں تب بھی اس میں زمین میں گڑھے ہونے کا مفہوم شامل ہے مثلاًوَالْجِبَالَ أَوْتَادًا[16] یعنی "اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا"،وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا[17] یعنی "اور پہاڑ اس میں گاڑ دئے"،وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ[18] یعنی "پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے گاڑ دئے گئے" اور وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ وَأَسْقَيْنَاكُم مَّاء فُرَاتًا[19] یعنی "اور ہم نے اس میں اونچے اونچے لنگر ڈالے اور ہم نے تمہیں خوب میٹھا پانی پلایا"۔ جبکہ ہم انھیں آیات کے تراجم دیکھتے ہیں تو ایک ہی مترجم مختلف مقامات پر مختلف الفاظ کا انتخاب کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک مقام پر مکمل مفہوم ادا کرنے والا لفظ ہے دوسرے مقام پر نامکمل ہے۔ مثلاً احمد رضاؒ نے سورۃ النحل میں 'لنگر ڈالے' لکھا تو سورۃ النازعات میں 'پہاڑوں کو جمایا' سے ترجمہ کیا۔ اسی طرح مودودیؒ نے لفظرَوَاسِيَ کے لئے ہی سورۃ النمل میں 'پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں' سے ترجمہ کیاتو سورۃ المرسلٰت میں 'پہاڑ جمائے' لکھا۔ یہی بشری کمزوریاں ہیں اور اس لحاظ سے بھی کلامِ معجز کا ترجمہ مشکل ہو جاتا ہے۔

سَوَاء لِّلسَّائِلِينَ کا ترجمہ بھی دو مختلف معنوں میں ہوا ہے،ایک ٹھیک جواب پوچھنے والوں کو، دوسرے تمام مانگنے والوں یا ضرورت مندوں کی طلب و حاجت کے مطابق۔ سیاق کے اعتبار سے دوسرے معنی قابل ترجیح ہیں کیونکہ یہاں اس بات کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے کہ یہ کام کتنے دن میں ہوا جو اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ اللہ تعالٰی نے تخلیقِ ارض کے وقت ہی قیامت تک کے لیئے انسانوں اور اس میں بسنے والے تمام حیوانات و حشرات سمیت تمام مخلوقات کی ضرورت کا بہترین اندازہ سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔

تخلیقِ کائنات

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاء كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (الانبیاء: 30)

کیا کافروں نے یہ خیال نہ کیا کہ آسمان اور زمین بند تھے تو ہم نے انہیں کھولا اور ہم نے ہر جاندار چیز پانی سے بنائی تو کیا وہ ایمان لائیں گے۔(احمد رضاؒ)

کیا کافر لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان وزمین باہم ملے جُلے تھے پھر ہم نے انہیں جُدا کیا اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے پیدا کیا کیا یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔(محمد جوناگڑھیؒ)

کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبیؐ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے اِنہیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟(مودودیؒ)

کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے کہ آسمان وزمین منھ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا اور بنائی ہم نے پانی سے ہر ایک چیز جس میں جان ہے۔ پھر کیا یقین نہیں کرتے۔(محمود حسنؒ)

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا کا ترجمہ کیا کافروں نے یہ خیال نہ کیا، کیا کافر لوگوں نے یہ نہیں دیکھا، کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبیؐ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے، کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے، سے کیا گیا۔اس مقام پر رویئتِ عینی نہیں بلکہ رویئتِ قلبی مراد ہے۔یعنی غور کرنا۔جن مترجمین نے يَرَ کا ترجمہ دیکھنے سے کیا انھوں نے بھی تفسیر میں اس سے مراد غور کرنا ہی لیا ہے۔لہٰذا، غور کرنے کے معنوں میں ترجمہ کرنا لائقِ ترجیح ہے۔

كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا کا ترجمہ آسمان اور زمین بند تھے تو ہم نے انہیں کھولا، آسمان وزمین باہم ملے جُلے تھے پھر ہم نے انہیں جُدا کیا، آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے اِنہیں جدا کیا، آسمان وزمین منہ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا، سے کیا گیا ہے۔اس آیت میں لفظ رَتْقًا کے مندرجہ ذیل معنی سامنے آتے ہیں:

کسی چیز کا گڈ مڈ شدہ اور جُڑی ہوئی ہونا[20] جوڑنا، بند کرنا[21] اور فَتَقَ کے معنی یہ آئے، کسی چیز کو بڑا شگاف ڈال کر کھول دینا جیسے نافہء مشک کو کھولا جاتا ہے، الگ کرنا[22] ، پھاڑنا (کپڑے کی سلائی)، ادھیڑنا[23]۔

احمد رضاؒ اور محمود حسنؒ نے بند ہونے اور کھولنے کے معنوں میں ترجمہ کیا جبکہ جوناگڑھیؒ اور مودودیؒ نے باہم ملے ہوئے اور جُدا ہونے کے معنوں میں کیا ہے۔ یہاں پہلے معنی منہ بند تھے یا بند تھے کا مفہوم غیر واضح ہے جبکہ باہم ملے ہوئے تھے اور ان کے جُدا ہونے کا مفہوم واضح ہے اور حالیہ دور کے انکشافات کے مطابق بھی ہے جیسا کہ ہمیں بِگ بینگ کے نظریہ سے پتہ چلتا ہے کہ کائنات کا ظہور ایک انتہائی کثیف اور اعظم ترین درجہ حرارت والے مادے کے پھٹنے سے ہوا ہے[24]۔

اس کا مطلب بیان کرنے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے۔ قدیم مفسرین کے نزدیک آسمان کے کھولنے سے مراد آسمانی بارش کا نزول اور زمین کے کھولنے سے مراد پیداوار کا اگنا ہے۔ تمام مفسرین نے اس کے معنی کو یہیں تک محدود رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی یہی معنی بیان ہوئے۔ اور کسی نے بھی اس سے مختلف معنی مراد لینا گوارا نہیں کیا۔ معارف القرآن میں اسی معنی کی تائید میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ ابنِ عطیہ عوفی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ تفسیر حسن اور جامع اور سیاق و سباق قرآن کے مناسب ہے۔ اس میں منکرین کے خلاف عبرت اور حجّت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتوں اور قدرتِ کاملہ کا اظہار بھی جو معرفت و توحید کی بنیاد ہے اور بعد کی آیت میں جو (پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی) فرمایا گیا اس سے اسی معنی کے اعتبار سے مناسبت ہے۔

مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں اس آیت کی جدید علمی انکشافات کے مطابق تفسیر کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"رَتَقَ کے معنی یکجا ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جُڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق ہونا اور فَتَقَ کے معنی پھاڑنے اور جُدا کرنے کے ہے۔ بظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک تودے (Mass) کی تھی بعد میں اس کو الگ الگ حصوں میں تقسیم

کر کے زمین اور دوسرے اجرامِ فلکی جُدا جُدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے۔ قدیم زمانے میں لوگوں کے لیے آسمان و زمین کے رتق و فتق، پانی سے ہر زندہ چیز کے پیدا کیے جانے اور تاروں کے ایک ایک فلک میں تیرنے کا مفہوم کچھ اور تھا اور موجودہ زمانے میں طبیعیات، حیاتیات اور علمِ ہئیت کی جدید معلومات نے ہمارے لئے ان کا مفہوم کچھ اور کر دیا۔ اور نہیں کہہ سکتے کہ آگے چل کر انسان کو جو معلومات ہونی ہیں وہ ان الفاظ کے کن معانی پر روشنی ڈالیں گی۔ بہرِ حال موجودہ زمانے کا انسان ان آیات کو اپنی جدید ترین معلومات کے مطابق پاتا ہے۔"

اس آیت میں مفسرین نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے کے احترام میں قدیم تفسیر کی ہے لیکن یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ہے اور اس قول کی نسبت نبی ﷺ کی طرف نہیں ہے۔ اس طرح ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تاویل میں علمائے امت کے لئے یہ سبق ہے کہ وہ قرآن میں علم و شعور کی روشنی میں تدبّر و تفکّر کریں اور لوگوں میں اللہ کے کلام کی عظمت کا احساس دلائیں۔ یہ بات تکریمِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف نہیں ہے بلکہ انھیں سے سیکھا ہوا منہج ہے۔ ظاہر ہے اس وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس آیت کی جدید معلومات کے مطابق تفسیر فرمائیں انھوں نے ذاتی مشاہدہ سے جو نتیجہ اخذ فرمایا وہ اُس دور کے اعتبار سے ایک عظیم کوشش تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج بھی علماء اسی نہج پر تدبّر فرمائیں اور قرآن کے علمی اعجازات کو آشکارا کریں۔

کائنات کا پھیلاؤ

وَالسَّمَاء بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمَاهِدُونَ (الذّاریات:47،48)

اور آسمان کو ہم نے ہاتھوں سے بنایا اور بیشک ہم وسعت دینے والے ہیں۔ اور زمین کو ہم نے فرش کیا تو ہم کیا ہی اچھے بچھانے والے۔ (احمد رضاؒ)

آسمان کو ہم نے (اپنے) ہاتھوں سے بنایا ہے اور یقیناً ہم کشادگی کرنے والے ہیں۔ اور زمین کو ہم نے فرش بنا دیا ہے۔ پس ہم بہت ہی اچھے بچھانے والے ہیں۔ (محمد جوناگڑھیؒ)

آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اِس کی قدرت رکھتے ہیں۔ زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں۔ (مودودیؒ)

اور بنایا ہم نے آسمان ہاتھ کے بَل سے اور ہم کو سب مقدور ہے، اور زمین کو بچھایا ہم نے سو کیا خوب بچھانا جانتے ہیں ہم۔ (محمود حسنؒ)

احمد رضاؒ اور جوناگڑھیؒ نے أَيْدٍ کا ترجمہ ہاتھ سے کیا۔ جو عربی محاورہ کی رو سے کمزور معلوم ہوتا ہے۔ عربی میں يَدٌ (ہاتھ) کی جمع اَيَادِی ہے اور أَيْد زور یا قوت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ سورہ ص، آیت 17 میں آیا ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کریں جو بڑی قوت والا تھا۔ جس طرح اس مقام پر 'ہاتھوں والے داؤد' سے ترجمہ کرنا نامناسب ہے اسی طرح اس آیت میں بھی ہاتھ کے معنی میں ترجمہ کرنا نامناسب ہے۔ محمود حسنؒ نے 'ہاتھ کے بَل' سے ترجمہ کیا جس میں کم از کم ہاتھ کی قوت کی طرف اشارہ ہے۔ ہاتھ کے بَل کی تفسیر میں مولانا شفیع عثمانیؒ نے معارف القرآن میں لکھا ہے کہ: لفظ أَيْدٍ قوت اور قدرت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مقام پر قوت یا قدرت کے معنوں میں ترجمہ کرنا سورہ حٰم السجدہ، آیت 11 کی رُو سے بھی قابلِ ترجیح ہے،

"پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اُس وقت محض دھواں تھا اُس نے آسمان اور زمین سے کہا وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو، دونوں نے کہا: ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح۔"

وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ میں مُوسِعُونَ کا ترجمہ ہم وسعت دینے والے ہیں، ہم کشادگی کرنے والے ہیں، ہم اِس کی قدرت رکھتے ہیں اور ہم کو سب مقدور ہے، سے کیا گیا ہے۔

یہاں مُوسِعُ اگر وَسَعَ سے ہے تب طاقت و قدرت رکھنے والے کا مطلب آتا ہے۔ مودودیؒ نے اپنی تفسیر میں مُوسِعُ کے دو معنی بیان کیے، ایک طاقت و قدرت رکھنے والے دوسرے وسعت دینے یا وسیع کرنے والے کے۔ دوسرے معنوں کے اعتبار سے لکھتے ہیں "مطلب یہ ہے کہ اس وسیع کائنات کو ہم ایک

دفعہ بنا کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ مسلسل اس میں توسیع کر رہے ہیں اور ہر آن اس میں ہماری تخلیق کے نئے نئے کرشمے رونما ہو رہے ہیں۔ایسی زبردست خلاق ہستی کو تم نے اعادہ خلق سے عاجز کیوں سمجھ رکھا ہے؟"

تفسیر میں آپ نے دونوں معنی بیان کیے لیکن ترجمہ میں طاقت وقدرت سے ترجمہ کیا۔اس طرح 'زور' اور 'قوت' سے ایک ہی مضمون کو دو مرتبہ بیان کیا۔ یہاں مُوسِعُونَ کا مکمل ترجمہ کسی نے بھی نہیں کیا۔ مُوسِعُونَ اسم فاعل ہے جس میں استمراریت ہوتی ہے یعنی پھیلاؤ کا عمل جاری ہے۔ان معنوں کے اعتبار سے میری حقیر دانست میں مکمل مفہوم اس طرح ہو سکتا ہے:

"ہم نے آسمان کو اپنی قوت سے بنایا اور بلاشبہ ہم اس میں توسیع کر رہے ہیں۔"انگریزی میں حامد عبدالرحمٰن الکاف اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر قرآن The Simplified Quran میں اسی طرز پر ترجمہ کیا۔

"We have built the sky with the power and We are expanding it"

جدید معلومات کی رو سے کائنات پھیل رہی ہے جس کا انکشاف 1926ء میں ایڈوین ہبل(Edwin Hubble)نامی سائنسداں نے کیا۔ایڈوین ہبل نے یہ دریافت کیا کہ کائنات مسلسل یکساں شرح سے پھیل رہی ہے اور اس کے پھیلنے کی شرح 500کلومیٹر فی سکنڈ فی میگا پارسیک ہے[25]۔(1 میگا پارسیک 3.26 ملین نوری سال کے برابر ہوتا ہے۔)

إِنَّ کے ساتھ لامِ تاکید سے دوہری تاکید پیدا ہوئی ہے جسے ترجمہ میں بیشک، ہم ہی، ہم ضرور جیسے الفاظ کے اضافہ سے تاکیدی مفہوم پیدا ہوتا ہے۔یہ عربی کا خاص طرز ہے جس سے دوہری تاکید پیدا ہوتی ہے اس کو ترجمہ میں منتقل کرنا مشکل ہے۔

وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا

زمین بچھانے کے لئے عربی میں دو الفاظ آئے ہیں۔ایک فَرَشَ اور مَهَدَ۔مَهَدَ میں فرش سے زیادہ وسعت ہے۔ فرش بستر لگانا اور ہر وہ چیز جو بچھائی جائے۔فرش کے بنیادی معنی کسی چیز کو پھیلانا اور فراخ کرنا ہے۔مَهَدَ میں

تربیت کا پہلو بھی شامل ہے۔مَهَدَالاَرضَ کے معنی یہ ہوں گے کہ زمین کو اس طرح پھیلانا کہ اس کے باشندگان کو وسائل رزق بھی مناسب طور پر مہیا ہوں[26]۔

نوٹ: احسن البیان کا جدید ایڈیشن جو مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کی نظرِ ثانی کے بعد طبع ہوا اس میں ترجمہ میں بعض اصلاحات کی گئیں جس میں یہ آیت بھی شامل ہے۔آسمان کو ہم نے قوت کے ساتھ بنایا اور یقیناً ہم کشادگی کرنے والے ہیں۔ہم نے اول ترجمہ کو اس لئے منتخب کیا کہ وہ جوناگڑھی کے قلم سے ہے۔

بحریات

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا (الفرقان: 53)

اور وہی ہے جس نے ملے ہوئے رواں کئے دو سمندر یہ میٹھا ہے نہایت شیریں اور یہ کھاری ہے نہایت تلخ اور ان کے بیچ میں پردہ رکھا اور روکی ہوئی آڑ (احمد رضاؒ)

اور وہی ہے جس نے دو سمندر آپس میں ملا رکھے ہیں۔یہ ہے میٹھا اور مزیدار اور یہ ہے کھاری کڑوا اور ان دونوں کے درمیان ایک حجاب اور مضبوط اوٹ کر دی۔(محمد جوناگڑھیؒ)

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے ایک لذیذ و شیریں دوسرا تلخ و شور۔اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔(مودودیؒ)

اور وہی ہے جس نے ملے ہوئے چلائے دو دریا۔یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور یہ کھاری ہے کڑوا۔اور رکھا ان دونوں کے بیچ پردہ اور آڑ روکی ہوئی۔(محمود حسنؒ)

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ کا ترجمہ ملے ہوئے رواں کئے دو سمندر، دو سمندر آپس میں ملا رکھے ہیں، دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ملے ہوئے چلائے دو دریا سے کیا گیا ہے۔مَرَجَ-الشئی کے معنی ملانا، مَرَجَ الدَّابۃ کے معنی جانور کو چراگاہ میں چرنے کے لئے چھوڑنا[27]۔دو چیزوں کا آپس میں اس طرح ملنا کہ ان کی

انفرادی حیثیت بھی برقرار رہے۔غُصن مَرِیج کے معنی باہم گتھی ہوئی ٹہنی[28]اس طرح مَرَجَ کے معنی باہم ملنا جس میں انفرادی حیثیت بھی برقرار رہے اور بمعنی چھوڑنا اگر لیا جائے تو اس کے معنی رواں کرنے کے بھی آتے ہیں۔اس طرح احمد رضاؒ اور محمود حسنؒ کے ترجمہ میں دونوں معنی در آئے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر مودودیؒ نے عصری معلومات کے مطابق کی ہے۔لکھتے ہیں:

"یہ کیفیت ہر اس جگہ رونما ہوتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آکر گرتا ہے۔اس کے علاوہ خود سمندر میں بھی مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس پر قائم رہتا ہے۔"

شفیع عثمانیؒ نے بھی مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ سے دو دریاؤں کو ملانے کا مفہوم لیا ہے۔لکھتے ہیں"وہ ایسا ہے جس نے دو دریاؤں کو صورتاً ملایا جن میں ایک کا پانی تو شیرین تسکین بخش ہے اور ایک کا پانی شور تلخ ہے۔اور باوجود اختلاط صوری کے حقیقتاً اُن کے درمیان اپنی قدرت سے ایک حجاب اور اختلاطِ حقیقی سے مانع ایک قویٰ رکھ دیا جو خود خفی اور غیر محسوس ہے۔مگر اس کا اثر یعنی امتیاز دونوں پانی کے مزے میں محسوس و مشاہد ہے۔" انھوں نے بھی دریاؤں کے سمندروں میں ملنے کے مقامات اور سمندروں کے نیچے شیریں تلخ پانی کے الگ ہونے کا تذکرہ کیا۔اور ایسے چند مقامات کا ذکر بھی کیا جہاں ایسے نمونے پائے جاتے ہیں۔

صلاح الدین یوسفؒ نے مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ کے معنی خَلَقَ المائنینِ اور حجرا محجوراً کے معنی حَرَاماً محرماً لئے ہیں۔یعنی دو پانی پیدا کئے ایک میٹھا اور دوسرا کھارا اور دونوں کا وجود الگ الگ مقامات پر بتلاتے ہیں کہ میٹھا پانی آبادیوں میں تو کھارا پانی سمندروں میں ہے۔اس کے بعد اپنی تقریر کا رُخ کھارے پانی کے افادیت کی طرف موڑتے ہیں۔جبکہ اس آیت میں یہ حقیقت بیان ہو رہی ہے کہ دونوں قسم کے پانی کا مل کر بھی جُدا ہونا قدرت کی بڑی کاریگری ہے۔مختلف مقامات پر الگ الگ خصوصیات والا پانی پایا جانا کارخانہء قدرت میں نئی بات نہیں ہے۔

قرآن مجید کے ابتدائی مفسرین دو مختلف سمندروں کے پانیوں کے لئے بظاہر متضاد مطلب کو بیان کرنے سے قاصر تھے یعنی وہ باہم یک جان بھی ہو جاتا ہے اور اس کے درمیان پردہ بھی حائل رہتا ہے۔ عصرِ حاضر کی جدید سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ دو سمندروں کے مقامِ اتصال پر ان کے درمیان ایک پردہ موجود ہوتا ہے۔ دونوں کا الگ الگ نہ صرف مزہ بلکہ درجہء حرارت، کھارا پن اور کثافت برقرار رہتی ہے۔ یہ حقیقت بھی دریافت ہو چکی ہے کہ جہاں سمندر کا میٹھا اور تازہ پانی کھارے پانی میں گرتا ہے وہاں مختلف کثافت رکھنے والا پکنو کلائن زون دونوں پانیوں کی لہروں کو واضح طور پر الگ الگ رکھتا ہے۔ اس زون کا ذائقہ بھی میٹھے اور کھارے پانی سے مختلف ہوتا ہے۔ اس قسم کے مظاہرِ قدرت میں سے ایک مصر میں دریائے نیل کا بحیرہءروم میں شامل ہونے کی جگہ بھی ہے[29]۔

هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ کا ترجمہ یہ میٹھا ہے نہایت شیریں اور یہ کھاری ہے نہایت تلخ ، یہ ہے میٹھا اور مزیدار اور یہ ہے کھاری کڑوا، ایک لذیذ و شیریں دوسرا تلخ و شور، یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور یہ کھاری ہے کڑوا سے کیا گیا ہے۔

یہاں مودودیؒ نے خوبصورت الفاظ استعمال کئے ہیں اور هٰذَا کا لفظی ترجمہ نہ کرنے سے اس میں روانی اور خوبصورتی پیدا ہو گئی جیسے ایک لذیذ و شیریں دوسرا تلخ و شور۔ لیکن دوسرے فقرہ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا کے ترجمہ میں 'پردہ حائل ہے' کے بجائے 'پردہ رکھا' سے ترجمہ کرتے تو اس کے بنانے والے یعنی اللہ کا احساس قاری کے دل میں پیدا ہوتا۔ قرآن میں جہاں بھی اللہ کی نشانیوں کا ذکر ہوتا ہے وہاں عموماً اللہ کا اسم یا ضمیر بطورِ فاعل آتی ہے۔ ترجمہ میں بھی اس کا لحاظ رکھا جائے تو بہتر ہے۔ جس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جس نشانی کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے اس کے ساتھ اس کے خالق کا بھی احساس دل میں پیدا ہوتا ہے۔

نباتات میں جوڑے

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاء مَاء فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىَ (طٰہٰ: 53)

وہ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا کیا اور تمہارے لئے اس میں چلتی راہیں رکھیں اور آسمان سے پانی اُتارا تو ہم نے اس سے طرح طرح کے سبزے کے جوڑے نکالے۔ (احمد رضاؒ)

اسی نے زمین کو فرش بنایا اور اس میں تمہارے چلنے کے لئے راستے بنائے اور آسمان سے پانی بھی وہی برساتا ہے پھر اس برسات کی وجہ سے مختلف قسم کی پیداوار بھی ہم ہی پیدا کرتے ہیں۔ (محمد جوناگڑھیؒ)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا اور اس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے اور اوپر سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔ (مودودیؒ)

وہ ہے جس نے بنادیا تمہارے واسطے زمین کو بچھونا اور چلائیں تمہارے لئے اس میں راہیں اور اُتارا آسمان سے پانی پھر نکالی ہم نے اس سے طرح طرح کی سبزی۔ (محمود حسنؒ)

شوہر بیوی کے لئے زوج ہے اور بیوی شوہر کے لئے زوج ہے اور دونوں کو اکٹھے بھی زوج ہی کہتے ہیں۔ جس مخلوق میں نر اور مادہ کا وجود ہے اس میں زوج کا وجود ہے۔ اس میں زوج کا تصور بھی موجود ہے۔ چونکہ زوج میں مصاحبت یا ساتھی ہونے کا تصور بھی موجود ہے لہٰذا چند ہم جنس جاندار چیزوں کے اکٹھا ہو جانے پر بھی زوج کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس صورت میں زوج کے معنی قسم، تقسیم یا فرقہ ہوتے ہیں۔ ازواج کا لفظ مختلف قسم کے ہم جنس مجموعوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے[30]۔ جس طرح وَكُنتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً[31] یعنی تم لوگ اُس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔

لفظ شتّٰی کے معنی پراگندہ ہونا، بکھرا ہوا ہونا، متفرق ہونا اور جُدا جُدا ہونا۔ اگر ایک ہی چیز کے منتشر اجزاء کا اظہار مقصود ہو تو شتّٰی استعمال ہوتا ہے۔ اَنبَتَ کے معنی اُگانا ہے۔ اس لفظ میں خوراک وغیرہ کا

خیال رکھ کر نہایت اچھی طرح پرورش کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں ارشاد ہے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا۔۔الخ(آل عمران:37)

پس اسے اس کے پروردگار نے اچھی طرح قبول فرمایا اور اسے بہترین پرورش دی۔

اَنبَتَ کے ایک اور معنی 'جو کچھ زمین اُگائے' ہیں۔انبت البقل کے معنی سبزی کا اُگنا[32]۔

انبت کا مکمل ترجمہ جوناگڑھیؒ اور مودودیؒ نے کیا جبکہ سبزے اور سبزی کا اطلاق زمین سے پیدا ہونے والی پیداوار کی ایک محدود قسم پر ہوتا ہے۔اس طرح ہم اس سے کھیتی مراد لے سکتے ہیں۔ان معنوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىٰ میں جوڑے کا لفظ احمد رضاؒ نے ہی استعمال کیا۔لیکن تفسیر میں جوڑے سے مراد قسم قسم کی سبزی ہی لیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جس وقت یہ ترجمہ ہوا اس وقت نباتات میں نر اور مادہ کا تصور محال تھا۔بہر حال جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے احمد رضاؒ کے ترجمہ میں سائنسی حقیقت کو ملحوظ رکھا گیا۔دوسرے مترجمین نے أَزْوَاجًا کا ترجمہ مختلف قسم کے ہم جنس مجموعوں کے معنی میں کیا ہے۔یہ بھی درست ہے لیکن سائنسی حقائق کے نقطہء نظر سے "طرح طرح کی پیداوار کے جوڑے" مکمل ترجمہ ہو سکتا ہے جو کسی کے ہاں نہیں ملتا۔نباتات میں جوڑوں یعنی نر اور مادہ کا تصور گزشتہ دو صدی پرانا ہے۔جرمنی کے ایک ماہرِ نباتیات Wilhelm Hofmeister نے 1851ء میں واضح کیا کہ نباتات میں نر اور مادّہ ہوتے ہیں اور ان میں بالیدگی کی صلاحیت نر اور مادہ کی وجہ سے ہے[33]۔یہاں پر لفظ شَتَّىٰ میں بھی مختلف یا متفرق ہونے کے معنی ہے لہٰذا أَزْوَاجًا کے لئے دوبارہ وہی معنی نہ لے کر 'زوج' یعنی جوڑے کے معنی میں ترجمہ کرنے سے زیادہ وسیع مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

فَأَخْرَجْنَا بِهِ میں 'ہ' کی ضمیر پانی کی طرف ہے جسکو محمد جوناگڑھیؒ نے ترجمہ میں ضمیر کو کھول کر "اس برسات کی وجہ سے" لکھا جس سے مفہوم میں وضاحت پیدا ہو گئی کہ پانی کے ذریعہ سے زمین سے

پیداوار ہوئی۔فَأَخْرَجْنَا بِهِ کا ترجمہ صرف 'اس سے' کرنے سے زمین سے پیداوار ہونے کا مفہوم بھی نکلتا ہے۔

انسانی تخلیق کے مراحل

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝(المؤمنون: 12تا14)

بیشک ہم نے انسان کو چُنی ہوئی مٹّی سے بنایااور پھر اسے پانی کی بوند کیاایک مضبوط ٹھہراؤ میں پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کی پھٹک کیا پھر خون کی پھٹک کو گوشت کی بوٹی پھر گوشت کی بوٹی کو ہڈیاں پھران ہڈیوں پر گوشت پہنایا پھر اسے اور صورت میں اُٹھان دی تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا۔

(احمد رضاؒ)

یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر اسے نطفہ بنا کر محفوظ جگہ میں قرار دے دیا پھر نطفہ کو ہم نے جماہوا خون بنادیا پھر اس خون کے لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا کر دیا پھر گوشت کے ٹکڑے کو ہڈیاں بنادیں پھر ہڈیوں کو ہم نے گوشت پہنادیا پھر دوسری بناوٹ میں اس کو پیدا کر دیا۔ برکتوں والا ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔(محمد جوناگڑھیؒ)

ہم نے انسان کو مٹی کے سَت سے بنایا پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی پھر لوتھڑے کو بوٹی بنادیا پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔(مودودیؒ)

اور ہم نے بنایا آدمی کو چُنی ہوئی مٹی سے پھر ہم نے رکھا اس کو پانی کی بوند کر کے ایک جمے ہوئے ٹھکانے میں پھر بنایا اس بوند سے لہو جماہوا پھر بنایا اس لہو جمے ہوئے سے گوشت کی بوٹی پھر بنائی اس بوٹی سے ہڈیاں پھر

پہنایاان ہڈیوں پر گوشت پھر اُٹھا کھڑا کیااس کو ایک نئی صورت میں۔ سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔(محمود حسنؒ)

سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ کا ترجمہ چُنی ہوئی مٹی، مٹی کے جوہر اور مٹی سے ست سے کیا گیا۔سُلَالَة لفظ سل سے مشتق ہے جس کے معنی کسی شئے سے نکالی ہوئی چیز، یا خلاصہ ہے[34]۔ مٹی کی ایک قسم ہے۔یہ ایسی مٹی ہے جو ہاتھ سے چمٹ کر آئے۔یعنی لیس دار ہوتی ہے۔سورۃ الحجر میں بیان ہوا کہ انسان کو کالے سڑے ہوئے گارے سے بنایا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ(الحجر:26)

یقیناً ہم نے انسان کو کالی اور سڑی ہوئی کھنکناتی مٹی سے پیدا فرمایا ہے۔

اس آیت سے مٹی کی قسم کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاء مَّهِينٍ(السجدہ:7،8)

جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی اُس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر اُس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔

اس طرح یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ ایسی بہترین خلاق ہستی ہے جو انتہائی حقیر نظر آنے والی چیزوں سے بہترین مخلوق پیدا فرما دیتا ہے۔اس طرح سُلَالَةٌ میں آمیزہ کا معنی بھی نکلتا ہے۔اس لحاظ سے 'مٹی کے ست' اور 'مٹی کے جوہر' بہترین ترجمہ ہیں۔'چُنی ہوئی مٹی' سے ترجمہ کرنے میں زمین کے مختلف مقامات سے مٹی کے جمع کرنے کا مفہوم نکلتا ہے۔سُلَالَةٌ کے جتنے معنی ہم نے اوپر نقل کئے اس سے مٹی کی ایک خاص قسم جو چکنی اور لیس دار مادّے کی شکل کی تھی زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

قَرَارٍ مَّكِينٍ کے لیے محفوظ جگہ سے ترجمہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے مراد رحم مادر ہے جو نطفہ کی پرورش و حفاظت کا ضامن ہے۔اس میں 'مضبوط ٹھہراؤ' کے مقابلہ میں 'محفوظ مسکن' کی خصوصیات زیادہ ہیں۔

ان آیات میں مضغہ اور علقہ ایسی اصطلاحات ہیں جن کا پورا مفہوم اردو میں سمیٹنا مشکل ہے۔ان الفاظ کے حیرت انگیز معانی سامنے آئے ہیں،علقہ کے معنی خون ،جونک ، لٹکنے والی چیز اور چمٹنے والی چیز کے ہیں[35] اور جدید ترقیات اور طاقتور خوردبینوں کے ذریعہ جنین کے مرحلہ وار تخلیقی مراحل میں یہ تمام معنی منطبق ہوتے ہیں۔وہ پہلے خون بستہ کی شکل میں پھر جونک کی طرح مادر رحم سے چمٹ کر لٹکتا ہے۔اس کے بعد وہ مضغہ یعنی گوشت کی بوٹی جو منہ میں چبائے ہوئے بقیہ کے مماثل ہوتی ہے، کی شکل اختیار کرتا ہے۔اس طرح تمام معنوں کو سمیٹ کر ایک لفظ میں ترجمہ کرنا ناممکن ہے۔

جنس کا تعین

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ

(القیامہ: 37تا39)

کیا وہ ایک بوند نہ تھا اس منی کا کہ گرائی جائے پھر خون کی پھٹک ہوا تو اس نے پیدا فرمایا پھر ٹھیک بنایا تو اس سے دو جوڑے بنائے مرد اور عورت۔(احمد رضاؒ)

کیا وہ ایک گاڑھے پانی کا قطرہ نہ تھا جو ٹپکایا گیا تھا پھر وہ لہو کا لوتھڑا ہو گیا پھر اللہ نے اسے پیدا کیا اور درست بنا دیا پھر اسے جوڑے یعنی نر و مادّہ بنائے۔(محمد جوناگڑھیؒ)

کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحمِ مادر) میں ٹپکایا جاتا ہے پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کئے پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔(مودودیؒ)

بھلا نہ تھا وہ ایک بوند منی کی جو ٹپکی پھر تھا لہو جما ہوا پھر اس نے بنایا اور ٹھیک کر اُٹھایا پھر کیا اس میں جوڑا نر اور مادّہ۔(محمود حسنؒ)

اس آیت میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ بچے کی جنس کا تعین مرد کرتا ہے۔ جدید سائنس بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ بچہ کی جنس کا تعین مرد کی منی کرتی ہے۔ اس آیت میں 'ہ' کی ضمیر کس چیز کی طرف ہے یہ وضاحت تین مفسرین نے نہیں کی۔ نعیم الدین مراد آبادیؒ نے مِنْهُ سے مراد 'منی' یا 'انسان' لیا ہے۔ انسان عورت بھی ہو سکتی ہے۔ منی کی طرف 'ہ' کی ضمیر کا لوٹانا جدید سائنسی علوم سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ مرد کے خلیہ میں X اور Y کروموزومس ہوتے ہیں جو کہ عورت کے X سے ملاپ کرتے ہیں۔ XX کے ملاپ کی صورت میں لڑکی اور XY ملاپ کی صورت میں لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں عورت X ہی مہیا کرتی ہے جبکہ مرد کے کروموزوم کی تبدیلی سے جنس کا تعین ہوتا ہے[36]۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک صدیوں قبل تو دور کی بات آج سے 20 سال قبل بھی برّ صغیر میں بچہ کی جنس کے تعین کا ذمہ دار عورت کو ٹھہرایا جاتا رہا ہے۔ جبکہ قرآن میں جدید سائنسی حقیقت کی طرف 14 سو صدیوں پہلے ہی واضح اشارے ملتے ہیں۔

محمود حسنؒ نے فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى کا ترجمہ یوں کیا: 'پھر کیا اس میں جوڑا نر اور مادّہ'۔ یہاں مِنْهُ کا ترجمہ 'اس میں' سے کیا گیا۔ اس ترجمہ سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ 'ہ' کی ضمیر فَخَلَقَ فَسَوَّى کی طرف ہے یعنی انسان کے بننے اور ٹھیک ہونے کے بعد اس کی جنس بنائی، اس طرح کے معنی نکلتے ہیں۔ اور قواعد کی رو سے بھی مِنْهُ کا ترجمہ 'اس سے' ہی ہوتا ہے۔

فَجَعَلَ کا ترجمہ سب نے 'پھر بنایا' کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یکے بعد دیگرے تخلیق کے تین مراحل کے بیان ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تیسری آیت لفظ ثُمَّ کے بجائے حرف 'ف' سے شروع ہوئی ہے۔ میری حقیر دانست میں اس کا ایک اور ترجمہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، 'پس (اس منی) سے دو جوڑے، نر اور مادہ بنائے۔' اس طرح ترجمہ کرنے سے کلام کا آغاز جس سے ہوا، اختتام بھی اسی پر ہو رہا ہے اور منی سے زوجین کے بننے کی حقیقت بھی واضح ہو رہی ہے۔

یہاں ضمیر کا مرجع منی کی طرف لوٹانے کو قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے بھی تقویت ملتی ہے۔ جہاں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ نر اور مادہ کی تخلیق ٹپکنے والی بوند (یعنی مرد کی منی) سے کی گئی۔ ارشاد ہے:

وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ مِن نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ (النجم: 45،46)

اور یہ کہ اُسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا، ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔

اس آیت سے اس امر کی اور بھی وضاحت ہوتی ہے کہ جنس کے تعین میں مرد کی منی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

حوالہ جات

[1] کارم سید غنیم، آیاتِ کائنات کی سائنسی تشریح، مشمولہ آیات، مرکز الدراسات العلمیہ (علی گڑھ)، 1990ء، جلد اول، شمارہ سوم، ص19

[2] ڈاکٹر ہلوک نور باقی (ترکی)، ترجمہ سید محمد فیروز شاہ، اسلامک بک فاؤنڈیشن (دہلی)، 1994ء، ص6

[3] ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی، قرآن اور سائنس سے متعلق کچھ اہم مسائل، مشمولہ آیات، مرکز الدراسات العلمیہ (علی گڑھ)، 1990ء، جلد اول، ص46

[4] ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی، قرآن اور سائنس: ایک علمیاتی جائزہ، مشمولہ آیات، مرکز الدراسات العلمیہ (علی گڑھ)، 1996ء، جلد ہفتم، شمارہ اول دوم، ص18تا20

[5] ایضاً، ص27،28

[6] عبد العلیم عبد الرحمٰن، زمین کی کرّویت: سائنس اور قرآن کی روشنی میں، مشمولہ آیات، مرکز الدراسات العلمیہ (علی گڑھ)، 1998ء، جلد نہم، شمارہ 1،2،3، ص62

[7] ایضاً

[8] امام ترمذیؒ، سنن ترمذی، باب فضائل القرآن، حدیث 2906

[9] لوئیس معلوف، ترجمہ مولانا عبد الحفیظ بلیاوی، المنجد، مکتبہ قدوسیہ (لاہور)، 2009ء، ص406

[10] الانبیاء:32

[11] الرعد:2

[12] الملک:5

[13] الجن:8

[14] الحج:65

[15] پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم، قرآن کے جدید سائنسی انکشافات،، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2013ء، ص257

[16] النبا:7

[17] النازعات: 32

[18] الغاشیہ:19

[19] المرسلات:27

[20] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء، ص146

[21] لوئیس معلوف، ترجمہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، المنجد، مکتبہ قدوسیہ (لاہور)، 2009ء

[22] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء، ص146

[23] لوئیس معلوف، ترجمہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، المنجد، مکتبہ قدوسیہ (لاہور)، 2009ء

[24] www.britannica.com/science/big-bang-model

[25] www.asd.gsfc.nasa.gov/archive/hubble/overview/hubble_bio.html

[26] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء، ص188

[27] لوئیس معلوف، ترجمہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، المنجد، مکتبہ قدوسیہ (لاہور)، 2009ء

[28] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء، ص825

[29] ڈاکٹر عبدالکریم ذاکر نائک، قرآن اور جدید سائنس، ص44

[30] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء، ص249

[31] الواقعہ:7

[32] لوئیس معلوف، ترجمہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، المنجد، مکتبہ قدوسیہ (لاہور)، 2009ء

[33] https://news.ucsc.edu/2017/01/flora-unveiled.html

[34] لوئیس معلوف، ترجمہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، المنجد، مکتبہ قدوسیہ (لاہور)، 2009ء

[35] ایضاً

[36] www.sciencemag.org

باب ششم

آخرت کے بیان سے متعلق آیات کے تراجم کا تقابلی مطالعہ

تمہید

تقریر و تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شعریت پیدا ہو جائے۔ شاعری کا زبان و ادب میں بہت بڑا مقام ہے۔ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ شاعری نہ ہونے کے باوجود کمال درجہ کا حسین، دلکش، فصیح و سادہ اسلوب میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "ہم نے نبی کو شعر نہیں سکھایا اور نہ ہی شاعری ان کے شایانِ شان ہے" (یٰس: 69)۔

قرآن میں مقدّس نغمگی اور ایسا پاکیزہ آہنگ پایا جاتا ہے جو شریفانہ جذبات کو حرکت میں لاتا ہے۔ قرآن کی تلاوت کے دوران یہ اسلوب آخرت کے بیان خصوصاً جنّت و جہنم کے تذکرہ میں بہت نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ ان آیات کی تلاوت آنکھوں کو اشکبار کرتی ہے اور دلوں کو طمانیت اور سرور بھی بخشتی ہیں۔ خشیت و محبت کی ملی جلی کیفیت کا وہ مناسب توازن اس کتاب میں پایا جاتا ہے کہ اس کی تلاوت کرنے والا اپنے رب کی رحمت و غفاریت کے سہارے غیر ذمہ دار اور فرض ناشناس نہیں بنتا اور قہاریت و انتقام کا تذکرہ سن کر مایوس بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان توازن کے ساتھ تقویٰ کی روش اختیار کرتا ہے۔

آخرت کے بیان میں ایک طرف اللہ کے انعامات و رحمت کا تذکرہ ہے جس سے دل اطمینان و فرحت کے ساتھ اس کے حصول کا متمنی بن جاتا ہے تو دوسری طرف ہولناک عذابات کا ذکر ملتا ہے جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ یہ تصور کتنا نشاط انگیز ہے کہ جنت میں جنتی لوگ اونچی مسندوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں اور غلمان جنتیوں کی خدمت میں پاکیزہ شراب انتہائی نفیس پیالوں میں لئے سونے چاندی کے

برتنوں کے ساتھ گردش کر رہے ہیں تو دوسری طرف یہ ہولناک منظر بھی ملتا ہے کہ جہنمیوں کو دردناک عذاب وزقّوم کے درخت سے ضیافت کی جارہی ہے۔

اس طرح ان کیفیات کا بہتر طور سے ترجمہ میں منتقل کرنا ایک مشکل امر ہے کہ بندہ پڑھتے وقت قرآنی آیات کی نغمگی کا حسن بھی محسوس کرے اور یہ ملی جلی کیفیت اس کے اندر پیدا ہو کہ وہ جنت کی شادمانی اور مغفرت کی امید میں نافرض شناس، ناشکرا اور غافل بننے سے بچے اور عذابات وانتقام اور احتساب کا ذکر سن کر نااُمید ہونے سے بچے۔اس قسم کی آیات میں اندازِ بیان اور ادبی محاسن کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ادبیت اور تاثیرِ کلام کو ترجمہ میں منتقل کرنا ایک مشکل امر ہے۔

تقابلی مطالعہ اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

جنّت کا منظر

وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا قَوَارِيرَ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا (الدّھر: 12تا22)

اوران کے صبر پر انہیں جنّت اور ریشمی کپڑے صلہ میں دیے، جنت میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوں گے، نہ اس میں دھوپ دیکھیں گے نہ ٹھٹر (سخت سردی) اوراس کے سائے ان پر جھکے ہوں گے اوراس کے گچھے جھکا کر نیچے کر دیے گئے ہوں گے اوران پر چاندی کے برتنوں اور کوزوں کا دور ہو گا جو شیشے کے مثل ہو رہے ہوں گے، کیسے شیشے چاندی کے ساقیوں نے انہیں پورے اندازہ پر رکھا ہو گا اوراس میں وہ جام پلائے جائیں گے جس کی ملونی ادرک ہو گی وہ ادرک کیا ہے جنت میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کہتے ہیں اوران کے آس پاس خدمت میں پھریں گے ہمیشہ رہنے والے لڑکے جب تو انہیں دیکھے تو انہیں سمجھے کہ موتی ہیں بکھیرے ہوئے اور جب تو ادھر نظر اٹھائے ایک چین دیکھے اور بڑی سلطنت ان کے بدن پر ہیں کریب کے سبز کپڑے اور قناویز کے اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے گئے اور انہیں ان کے رب نے ستھری شراب پلائی ان سے فرمایا جائے گا یہ تمہارا صلہ ہے اور تمہاری محنت ٹھکانے لگی۔ (احمد رضاؒ)

اور انھیں ان کے صبر کے بدلے جنت اور ریشمی لباس عطا فرمائے۔ یہ وہاں تختوں پر تکئے لگائے ہوئے بیٹھیں گے۔ نہ وہاں آفتاب کی گرمی دیکھیں گے نہ جاڑے کی سردی۔ ان جنتوں کے سائے ان پر جُھکے ہوئے ہوں گے اور ان کے گچھے نیچے لٹکائے ہوئے ہوں گے۔ اور ان پر چاندی کے برتنوں اور ان جاموں کا دور کرایا جائے گا جو شیشے کے ہوں گے۔ شیشے بھی چاندی کے جن کو (ساقی) نے اندازے سے ناپ رکھا ہو گا۔ اور

انھیں وہاں وہ جام پلائے جائیں گے جن کی آمیزش زنجبیل کی ہو گی۔ جنت کی ایک نہر سے جس کا نام سلسبیل ہے اور ان کے گرد گھومتے پھرتے ہوں گے وہ کمسن بچے جو ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ جب تو انھیں دیکھے تو سمجھے کہ وہ بکھرے ہوئے سچّے موتی ہیں۔ تو وہاں جہاں کہیں بھی نظر ڈالے گا سراسر نعمتیں اور عظیم الشان سلطنت ہی دیکھے گا۔ ان کے جسموں پر سبز باریک اور موٹے ریشمی کپڑے ہوں گے اور انھیں چاندی کے کنگن کا زیور پہنایا جائے گا۔ اور انھیں ان کا رب پاک صاف شراب پلائے گا۔ (کہا جائے گا) کہ یہ ہے تمہارے اعمال کا بدلہ اور تمہاری کوشش کی قدر کی گئی۔ (جوناگڑھیؒ)

اور اُن کے صبر کے بدلے میں اُنہیں جنّت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہاں وہ اونچی مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے نہ اُنہیں دھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی ٹھر۔ جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہو گی، اور اُس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (کہ جس طرح چاہیں انہیں توڑ لیں)۔ اُن کے آگے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش کرائے جا رہے ہوں گے۔ شیشے بھی وہ جو چاندی کی قسم کے ہوں گے، اور ان کو (منتظمین جنت نے) ٹھیک اندازے کے مطابق بھرا ہو گا۔ ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہو گی۔ یہ جنت کا ایک چشمہ ہو گا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں۔ وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک بڑی سلطنت کا سر و سامان تمہیں نظر آئے گا۔ اُن کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے، ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے، اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔ یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کار گزاری قابل قدر ٹھیری ہے۔ (مودودیؒ)

اور بدلہ دیا ان کو ان کے صبر پر باغ اور پوشاک ریشمی۔ تکیہ لگائے بیٹھیں اس میں تختوں کے اوپر نہیں دیکھتے وہاں دھوپ اور نہ ٹھر۔ اور جُھک رہیں ان پر اس کی چھائیں اور پست کر رکھے ہیں گچھے لٹکا کر اور لوگ لئے پھرتے ہیں ان کے پاس برتن چاندی کے اور آبخورے جو ہو رہے ہیں شیشے کے۔ شیشے ہیں چاندی کے ماپ

رکھا ہے ان کا ماپ اور ان کو وہاں پلاتے ہیں پیالے جس کی ملونی ہے سونٹھ۔ایک چشمہ ہے اس میں اس کا نام کہتے ہیں سلسبیل اور پھرتے ہیں ان کے پاس لڑکے سدا رہنے والے۔جب تو ان کو دیکھے خیال کرے کہ موتی ہیں بکھرے ہوئے، جب تو دیکھے وہاں تو دیکھے نعمت اور سلطنت بڑی۔اوپر کی پوشاک ان کے کپڑے ہیں باریک ریشم کے سبز اور گاڑھے۔اور ان کو پہنائے جائیں گے کنگن چاندی کے اور پلائے ان کو ان کا رب شراب جو پاک کرے دل کو۔یہ ہے تمہارا بدلہ اور کمائی تمہارے ٹھکانے لگی۔(محمود حسنؒ)

پہلی آیت کے فقرے وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا کے ترجمہ میں احمد رضاؒ اور محمود حسنؒ کے ہاں یہ نعمتیں عطا ہو چکنے کا مفہوم ہے۔کیونکہ احمد رضاؒ اور محمود حسنؒ نے جَزَاهُم کا ترجمہ 'صلہ میں دئے' اور 'بدلہ دیا ان کو' سے کیا۔جوناگڑھیؒ نے 'عطا فرمائے' سے کیا جس سے یہ دعایئہ مفہوم نکلتا ہے۔اور مودودیؒ نے 'عطا کرے گا' سے کیا جس میں وعدہ کئے جانے کا مفہوم ہے۔لفظی ترجمہ کے پہلو سے دیکھا جائے تو جَزَاهُم کا ترجمہ 'ان کو بدلہ دیا' ہوگا۔لیکن عربی کے اسالیبِ بیان کے اعتبار سے 'ان کو بدلہ دیا جائے گا' بھی درست ہے۔کیونکہ یہ اس اسلوب کے تحت آیا ہے جہاں مستقبل کا وعدہ ماضی کے صیغہ میں اس کے یقینی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔آئندہ جملہ میں جوناگڑھیؒ اور احمد رضاؒ نے مستقبل کے طرز پر ترجمہ کیا۔

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا کا ترجمہ اس کے سائے ان پر جھکے ہوں گے،ان جنتوں کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے، جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہو گی،اور جُھک رہیں ان پر اس کی چھائیں سے کیا گیا۔مودودیؒ نے ظِلَالُهَا کے لئے 'چھاؤں' اور 'سایہ' سے ایک ہی مفہوم کو دو مرتبہ لکھا ہے۔

آیت نمبر 14 میں وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا کے ترجمہ میں مودودیؒ نے "اور اُس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے" سے آزاد ترجمانی کی ہے جو بازبیانیہ کی بہترین مثال ہے لیکن ساتھ ہی پھلوں کے پکے ہوئے گچھے لٹکے ہوئے ہونے کی جو دلنشین تصویر قرآن میں ہے وہ منظر سے غائب ہو گئی۔

یُسْقَوْنَ مضارع مجہول کا صیغہ ہے جس کے معنی، پلائے جائیں گے، ہیں۔ محمود حسنؒ نے 'وہاں پلاتے ہیں' سے ترجمہ کیا۔ جو حال کی ترجمانی کرتا ہے۔

احمد رضاؒ نے عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا کے لئے 'وہ ادرک کیا ہے، جنت میں ایک نہر ہے جسے سلسبیل کہتے ہیں' سے ترجمہ کیا۔ اس جملے میں 'وہ ادرک کیا ہے' کے فقرے کے اضافہ سے مفہوم الٹ گیا ہے جس سے یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ وہ چشمہ گویا ادرک کا ہے، اور تھوڑی سی ادرک چشمہ میں ملنے سے مزہ خوشگوار ہوتا ہے لیکن چشمہ ہی ادرک کا ہو جائے تو یہ تلخ اور ناخوشگوار ہو جاتا ہے، بہر حال یہاں اشارہ اس شراب کی طرف ہے جس میں سونٹھ ملائی جائے گی۔

لفظ زنجبیل اردو میں غیر معروف ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ہونا چاہئے۔ جونا گڑھیؒ نے ترجمہ میں زنجبیل ہی لکھا ہے جبکہ دیگر مترجمین نے 'ادرک' اور 'سونٹھ' سے کیا ہے۔ زنجبیل کے معنی صاحبِ منجد نے شراب اور سونٹ لکھے ہیں۔ عرب میں سونٹھ کی آمیزش والی شراب پسند کی جاتی تھی اسی تناظر میں یہاں اس نعمت کا ذکر ہوا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو لفظ سونٹھ اس شراب کی بہتر ترجمانی کر رہا ہے جس کا ذکر یہاں ہوا ہے۔

لفظ ارائک، اریکۃ کی جمع ہے۔ قرآن میں تخت کے لئے تین الفاظ آئے ہیں: عرش بمعنی تختِ شاہی، ارائک بمعنی آرام دہ مسہری والی چارپائی جس میں ٹیک بھی لگائی جاس کے، سُرُر (سریر کی جمع) بمعنی ایسے تخت جس میں آرائش اور تزئین ہوتی ہے، خوشحال لوگ ٹھاٹ سے بیٹھنے کے لئے بنواتے ہیں[1]۔ ان معنوں کی روشنی میں ارائک کا صرف تخت سے ترجمہ کرنے میں مفہوم نامکمل ہے۔ ہماری زبان میں صرف تخت کے لفظ سے سخت لکڑی کا تختہ دار تخت ہی ذہن میں آتا ہے۔ مسہری/مسندوں والے تخت کا معنی مودودیؒ کے ترجمہ میں ہی ظاہر ہوا ہے۔ جنت کے پس منظر میں آرام دہ تختوں پر تکیوں پر ٹیک لگانے کا منظر زیادہ خوشگوار احساس قاری کے دل میں پیدا کرتا ہے۔

وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ کا ترجمہ ہمیشہ رہنے والے لڑکے، کمسن بچے جو ہمیشہ رہنے والے ہیں، ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، لڑکے سدا رہنے والے، سے کیا گیا ہے۔ عربی میں عمر کے اعتبار سے وِلْدَانٌ آٹھ سے دس سال کے بچوں کے لئے استعمال ہوتا ہے[2]۔اس لحاظ سے جوناگڑھی نے 'کمسن بچے' سے وِلْدَانٌ کا مکمل مفہوم ادا کیا۔ مودودیؒ کے ترجمہ میں بچّوں کے بچپن کا دوام ظاہر ہوتا ہے جبکہ باقی مترجمین کے ہاں ان کی زندگی یا بقا کے دوام کا مفہوم ملتا ہے۔ یہاں دونوں معنوں کی گنجائش ہے۔ جنت کی زندگی میں ہمیشگی ہر جنتی کو نصیب ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "اہلِ جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو ان کے جسم بالوں سے صاف ہوں گے، مسیں بھیگ رہی ہوں گی مگر داڑھی نہ نکلی ہوں گی۔ گورے چٹے ہوں گے، گٹھے ہوئے بدن ہوں گے، سب کی عمریں 33 سال ہوں گی" (مسند احمد اور ترمذی)۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنتی ہمیشہ جوان رہیں گے۔ اسی طرح اس آیت میں بچّوں کے لئے خاص طور پر ہمیشگی کا پروانہ ملنا ان کے بچپن اور نوخیزی کے دوام کے معنوں میں زیادہ اپیل کر رہا ہے۔

وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا کا ترجمہ اور انھیں ان کے رب نے سُتھری شراب پلائی، اور انھیں ان کا رب پاک صاف شراب پلائے گا، اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا، اور پلائے ان کو ان کا رب شراب جو پاک کرے دل کو، سے کیا گیا ہے۔ اس آیت کا احمد رضاؒ نے ماضی کے صیغہ میں ترجمہ کیا۔ مودودیؒ اور جوناگڑھیؒ نے مستقبل کے حوالہ سے کیا جبکہ محمود حسنؒ کا ترجمہ دعائیہ محسوس ہوتا ہے۔ دوسری طرف شَرَابًا طَهُورًا صفت موصوف کے طور پر آیا ہے لیکن محمود حسنؒ نے 'شراب جو پاک کرے دل کو' سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ لفظی اور معنوی دونوں لحاظ سے کمزور ہے۔ اس مقام پر شراب کی پاکیزگی بتانا ہی مقصود ہے کیونکہ انسان دنیا میں پاکیزہ شراب سے ناواقف ہے۔ دنیوی شراب مزے میں مکدر، اور پینے والوں کے لئے خوشگوار نہیں ہوتی ساتھ ہی انسانی صحت پر بُرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ دنیوی شراب کے برخلاف جنّت کی شراب پاکیزہ، پینے والوں کے لئے خوشگوار اور ہر قسم کے نقصان سے منزّہ ہوگی، جیسا کہ ارشاد ہے:

يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِن مَّعِينٍ ۝ بَيْضَاء لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ۝ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ۝ (الصّافّات: 45تا47)

شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے۔ چمکتی ہوئی شراب، جو پینے والوں کے لیے لذّت ہو گی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہو گا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہو گی۔ علاوہ ازیں جنتیوں کے دل جنت میں داخلہ سے پہلے ہی پاک کر دئے جائیں گے۔ جنت میں انھیں پاک کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا میں ثَمَّ ظرفِ مکان کے طور پر آیا ہے اس کے معنی 'وہاں' دیکھنے یا نظر اُٹھانے کے مقابلہ میں 'جہاں بھی نظر ڈالنے' میں زیادہ وسیع ہے۔ یہاں نَعِيمًا کا ترجمہ 'نعمت' سے کرنا 'چین' کے مقابلہ میں وسیع مفہوم پیش کر رہا ہے کیونکہ جنت میں سکون اور چین ان تمام نعمتوں میں سے جو بندے کو حاصل ہوں گے ان میں سے ایک نعمت ہے اور 'سراسر نعمتیں' یا 'نعمتیں ہی نعمتیں' زیادہ وسیع مفہوم میں ہیں۔ دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو عربی الفاظ میں باریک فرق کو احمد رضاؒ نے ملحوظ رکھا، نَعِيمًا کا ترجمہ عام طور پر نعمت ہی کیا جاتا ہے لیکن اس کے لئے عربی میں لفظ نِعمَۃ آتا ہے جس کا مطلب اللہ کی بخشی ہوئی چیز ہے اور نَعِیم آرام و آسائش کے لئے آتا ہے، اس طرح احمد رضاؒ نے آرام کے مترادف لفظ 'چین' سے ترجمہ کیا۔

ان آیات میں روانی اور سلاست کے پہلو سے جوناگڑھیؒ اور مودودیؒ کے تراجم بہتر ہیں۔ کیونکہ ان آیات میں جنت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس حُسن کو ترجمہ میں منتقل کرنے کے لئے یہی طرزِ ترجمہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ محمود حسنؒ کا ترجمہ لفظی ہونے کی وجہ سے اس حُسن سے خالی ہے۔ احمد رضاؒ کے ترجمہ میں چند آیات میں روانی ہے اور چند آیات میں روانی اور جملہ بندی ٹوٹ گئی ہے۔ مودودیؒ اور جوناگڑھیؒ کے تراجم میں جوناگڑھی نے محتاط ترجمانی کی ہے اور الفاظ کے ترجمہ میں اس کے معنوی حدود کا لحاظ رکھا اور انھیں معنوں میں ترجمہ کیا جو اس لفظ کے لئے لغت میں ملتے ہیں۔ جبکہ مودودیؒ کے ہاں آزاد ترجمانی ملتی

ہے۔انھوں نے مفہوم کے اعتبار سے لفظی قیود سے آزاد ہو کر ترجمہ کیا۔ مثال کے طور پر 'وہاں آفتاب کی گرمی دیکھیں گے نہ جاڑے کی سردی'(جوناگڑھیؒ) کو مودودیؒ نے 'نہ انھیں دھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی ٹھر' سے کیا۔اسی طرح وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا کا ترجمہ 'اور ان کے گچھے نیچے لٹکائے ہوئے ہوں گے (جوناگڑھیؒ) کے لئے 'اور اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (مودودیؒ)' سے کیا۔

عربی زبان کا ایک اسلوب یہ ہے کہ مستقبل میں جس واقعہ کا ہونا قطعی اور یقینی ہو اس کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔یعنی کسی واقعہ کا مستقبل میں پیش آنا اتنا ہی یقینی ہے جیسے وہ پیش آچکا ہو۔یہ اسلوب اردو میں غیر معروف ہے۔اس کا ترجمہ کرتے ہوئے مستقبل کے تناظر میں ترجمہ کرنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔اس بات کا لحاظ مودودیؒ اور جوناگڑھیؒ کے ترجمہ میں ملتا ہے۔احمد رضاؒ نے کچھ جملے مستقبل کے صیغہ میں کئے اور کچھ ماضی کے صیغہ میں۔

عَيْنًا فِيهَاتُسَمَّى سَلْسَبِيلًا کے ترجمہ میں محمود حسنؒ نے 'ایک چشمہ ہے اس میں اس کا نام کہتے ہیں سلسبیل' لکھا ہے۔یہاں تُسَمَّى کے لئے 'اس کا نام' اور 'کہتے ہیں' سے ایک ہی معنی کو دو بار ادا کیا۔

جہنّم کا منظر

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (الھمزہ)

خرابی ہے اس کے لیے جو لوگوں کے منہ پر عیب کرے پیٹھ پیچھے بدی کرے جس نے مال جوڑا اور گن گن کر رکھا، کیا یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے دنیا میں ہمیشہ رکھے گا ہر گز نہیں ضرور وہ روندنے والی میں پھینکا جائے گا اور تو نے کیا جانا کیا روندنے والی، اللہ کی آگ کہ بھڑک رہی ہے وہ جو دلوں پر چڑھ جائے گی بیشک وہ ان پر بند کر دی جائے گی لمبے لمبے ستونوں میں۔(احمد رضاؒ)

بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کی جو عیب ٹٹولنے والا، غیبت کرنے والا ہے۔ جو مال کو جمع کرتا جائے اور گنتا جائے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا۔ ہر گز نہیں یہ تو ضرور توڑ پھوڑ دینے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ اور تجھے کیا معلوم ایسی آگ کیا ہو گی۔ وہ اللہ کی سُلگائی ہوئی آگ ہو گی۔ جو دِلوں پر چڑھتی چلی جائے گی۔ وہ ان پر ہر طرف سے بند کی ہوئی ہو گی بڑے بڑے ستونوں میں۔ (جونا گڑھیؒ)

تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خو گر ہے۔ جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا۔ ہر گز نہیں، وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ ؟ اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی۔ جو دلوں تک پہنچے گی وہ اُن پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اِس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے)۔ (مودودیؒ)

خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے، عیب چُننے والے کی۔ جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا۔ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال سدا کو رہے گا اس کے ساتھ۔ کوئی نہیں وہ پھینکا جائے گا اس روندنے والی میں اور تو نے کیا سمجھا کو ن ہے وہ روندنے والی۔ ایک آگ ہے اللہ کی سُلگائی ہوئی۔ وہ جھانک لیتی ہے دل کو۔ ان کو اس میں موند دیا ہے لمبے لمبے ستونوں میں۔ (محمود حسنؒ)

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ کا ترجمہ احمد رضاؒ نے استفہامیہ انداز میں کیا باقی سب نے خبریہ جملے میں ترجمہ کیا۔ يَحْسَبُ میں استفہام کی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ اس لئے اس کا خبریہ جملے میں ترجمہ کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ البتہ 'اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا' اگلے جملے میں 'ہر گز نہیں وہ حطمہ میں ڈالا جائے گا' سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ یعنی اسے یہ مال ہمیشگی تو نہیں بخشے گا بلکہ موت کے بعد وہ آگ میں جائے گا۔ یہ مفہوم ہے جو باقی تراجم سے ممتاز ہے۔ اس کے علاوہ خَلَّدَهُ واَخلَدَهُ کے معنی ہیں ہمیشہ رکھنا، دوام عطا کرنا، حیاتِ ابدی بخشنا[3]۔

مودودیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں یہ دوسرے معنی اس طرح لکھے ہیں: "دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ سمجھتا ہے اس کا مال اسے حیاتِ جاوداں بخش دے گا"۔ لیکن انھوں نے ترجمہ میں مال کے ہمیشہ رہنے کا مفہوم لیا ہے۔

اس مقام پر "اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا" کے معنوں میں ترجمہ کرنا لغت کے اعتبار سے اور ربط آیات کی مناسبت سے بھی کمزور ہے۔ پہلے معنی زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔

حُطَمَة کا ترجمہ توڑ پھوڑ دینے والی، روندنے والی اور چکنا چور کر دینے والی سے کیا گیا۔ حَطَمَ توڑنے اور مروڑنے کے لئے آتا ہے۔ یہ لفظ کسی چیز کو روندنے اور ریزہ ریزہ کر دینے پر بھی بولا جاتا ہے[4]۔ یہاں اس لفظ کے تینوں مترجمین نے تین معنی اختیار کئے۔ اور تینوں معانی جہنم کے تناظر میں مطابقت رکھتے ہیں۔ لفظ حُطَمَة کے لئے جوناگڑھیؒ نے 'توڑ پھوڑ دینے والی آگ' لکھا اور دوسری مرتبہ اسی لفظ کے لئے 'ایسی آگ' سے ترجمہ کیا۔ اس لفظ کے معنوی حدود میں آگ کا مفہوم نہیں ہے جبکہ اس سے مراد جہنم، اس کی توڑ پھوڑ دینے والی صفت کی وجہ سے ہے۔ اگرچہ اس سے مراد جہنم کی آگ ہی ہے لیکن اس مقام پر آگ کو محذوف رکھنا ہی کسی خاص خبر کی طرف قاری کو متوجہ کرنے اور تجسس کی کیفیت پیدا کرنے میں معاون ہے۔ اگر مراد کو پہلے ہی کھول دیا جائے تو کلام کی خوبصورتی اور تاثیر متاثر ہوئی۔ جو خبر بعد میں آنی تھی وہ پہلے ہی ظاہر ہو گئی۔

نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ کا ترجمہ احمد رضاؒ اور مودودیؒ نے اللہ کی آگ، کہ بھڑک رہی ہے، اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی سے کیا جو زیادہ مؤثر ہیں۔ آگ کو اللہ سے نسبت دینے سے اس کی شدت اور ہولناکی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ نَارُ اللَّهِ مضاف مضاف الیہ کے طور پر ہیں اور الْمُوقَدَةُ صفت ہے جس کا موصوف مرکب اضافی نَارُ اللَّهِ ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ دو تراجم قابل ترجیح ہیں۔ ان دو ترجموں میں بھی مودودیؒ نے الْمُوقَدَةُ کا ترجمہ 'بھڑکائی ہوئی' سے کر کے اس کے مفعول ہونے کا اظہار کیا، جبکہ احمد رضاؒ نے سادہ خبر یہ جملہ میں 'بھڑک رہی ہے' سے ترجمہ کیا۔

تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ کا ترجمہ جو دلوں پر چڑھ جائے گی، جو دلوں پر چڑھتی چلی جائے گی، جو دلوں تک پہنچے گی، جو جھانک لیتی ہے دل کو سے کیا گیا ہے۔ الَّتِي تَطَّلِعُ، اِطَّلَعَ سے مشتق ہے۔ جس کے ایک معنی چڑھنے اور اوپر پہنچ جانے کے ہے دوسرے معنی باخبر ہونے اور اطلاع پانے کے ہے[5]۔طَلَعَ کے معنوں میں اگر بلندی سے نسبت ہو تو چڑھنا جیسے پہاڑ پر چڑھنا، طلع علی الامر۔جاننا،طلع البلاد۔ قصد کرنا، ارادہ کرنا، طلع المکان۔ کسی جگہ پہنچنا، طلع الکوکب۔نکلنا[6]۔اس طرح ان تمام معانی کی گنجائش ہے جو مترجمین نے کئے ہیں۔'دلوں تک چڑھنا'اور 'پہنچنا'اس مقام پر بچ رہا ہے۔ان دونوں میں بھی کیونکہ 'دل' یہاں انسانی جسم کے ایک مقام کی حیثیت سے آیا ہے تو'پہنچنا' بلیغ مفہوم پیش کر رہا ہے۔ یہاں آگ کے لئے 'جھانکنے' کا معنی غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔ جنھوں نے 'چڑھنا' سے ترجمہ کیا تفسیر میں دل تک پہنچنے کا مفہوم واضح کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ کا ترجمہ بیشک وہ ان پر بند کر دی جائے گی، وہ ان پر ہر طرف سے بند کی ہوئی ہو گی، وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی، ان کو اس میں موند دیا ہے سے کیا گیا۔ وصَدَ اس طرح بند کرنے کو کہتے ہیں کہ بند شدہ چیز سے کچھ باہر نہ نکل سکے۔ اوصدتُ القِدرَ کے معنی ہانڈی پر ڈھکنا دینا کہ بھاپ نہ نکل سکے[7]۔اس مکمل مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ڈھانک کر بند کرنا یا ہر طرف سے بند کرنا کے اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ صرف بند کرنے میں اوپر سے بھی ڈھکے ہونے کا مفہوم مفقود ہے۔ محمود حسنؒ نے مُّؤْصَدَةٌ کا ترجمہ 'موند دیا ہے' سے کیا۔ مُّؤْصَدَةٌ چونکہ مفعول کا صیغہ ہے اس لئے 'موند دیا جائے گا' ہوتا تو بہتر ہوتا۔

قیامت کا منظر

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ ۝ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۝ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۝ وَإِذَا الْمَوْؤُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ

قُتِلَتْ ۝ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝ وَإِذَا السَّمَاءِ كُشِطَتْ ۝ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ۝ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ۝ (التکویر: 1تا14)

جب دھوپ لپیٹی جائے اور جب تارے جھڑ پڑیں اور جب پہاڑ چلائے جائیں اور جب تھلکی اونٹنیاں چھوٹی پھریں اور جب وحشی جانور جمع کیے جائیں اور جب سمندر سلگائے جائیں اور جب جانوں کے جوڑ بنیں اور جب زندہ دبائی ہوئی سے پوچھا جائے کس خطا پر ماری گئی اور جب نامۂ اعمال کھولے جائیں، اور جب آسمان جگہ سے کھینچ لیا جائے اور جب جہنم بھڑکایا جائے اور جب جنت پاس لائی جائے ہر جان کو معلوم ہو جائے گا جو حاضر لائی۔ (احمد رضاؒ)

جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے اور جب دس ماہ کی اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں اور جب وحشی جانور اکٹھے کئے جائیں اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے اور جب جانیں (جسموں سے) ملا دی جائیں گی اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا کہ کس گناہ کی وجہ سے وہ قتل کی گئی اور جب نامہ اعمال کھولے جائیں گے اور جب آسمان کی کھال اُتار لی جائے گی اور جب جہنم بھڑکائی جائے گی اور جب جنت نزدیک کر دی جائے گی۔ اس دن ہر شخص جان لے گا جو کچھ لے کر آیا ہو گا۔ (محمد جوناگڑھیؒ)

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گیا ور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیے جائیں گے اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گیا ور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟ اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا اور جب جہنم دہکائی جائے گیا ور جب جنت قریب لے آئی جائے گیا س وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔ (مودودیؒ)

جب سورج کی دھوپ تہہ ہو جائے اور جب تارے میلے ہو جائیں اور جب پہاڑ چلائے جائیں اور جب بیاتی اونٹنیاں چُھٹی پھریں اور جب جنگل کے جانوروں میں رول پڑ جائے۔ جب دریا جھونکیں جائیں اور جب جیوں

کے جوڑے باندھے جائیں اور جب بیٹی جیتی گاڑ دی گئی کو پوچھیں کہ کس گناہ پر وہ ماری گئی اور جب اعمال نامے کھولے جائیں اور جب آسمان کا پوست اُتار لیں اور جب دوزخ دہکائی جائے اور جب بہشت پاس لائی جائے جان لے گا ہر ایک جی جو لے کر آیا۔ (محمود حسنؒ)

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے ترجمہ میں طرزِ بیان کے اعتبار سے لفظ کُوِّرَتْ (کَوَّرَ سے ماضی مجہول) کے لئے 'لپیٹی جائے اور تہہ ہو جائے' کے مقابلہ میں 'لپیٹ دیا جائے گا' میں زیادہ زور ہے۔ 'تہہ ہو جائے' سے محمود حسنؒ نے جو ترجمہ کیا وہ سادہ خبریہ جملہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کَوَّرَ کے معنی کسی چیز کو گولائی میں لپیٹنے کے بھی ہیں۔ کسی چیز کو عمامہ یا پگڑی کی طرح لپیٹنے اور اوپر تلے گھمانے کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس لفظ میں تجمّع اور گولائی دونوں تصوّر موجود ہوتے ہیں جو پگڑی میں پائے جاتے ہیں[8]۔ دھوپ کی روشنی تہہ کر دینے میں یہ مکمل مفہوم ترجمہ میں منتقل نہیں ہو سکا۔ اس کے مقابلہ میں لپیٹنا زیادہ بلیغ ہے۔ دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو احمد رضاؒ اور محمود حسنؒ نے یہاں استعارے کو کھول کر سورج کے بے نور ہونے کا مفہوم ترجمہ ہی میں واضح کر دیا۔

وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ کے ترجمہ میں انکدر کے معنی گدلا پن، دُھندلانا، میلا یا ہلکا پڑ جانا[9] اس کے ایک اور معنی تیز دوڑنا اور ٹوٹ پڑنے کے بھی ہیں[10]۔ اس طرح ایک لفظ بہت سی معنوی جہتوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس کا اردو متبادل تمام معنوی خصوصیات کے ساتھ ملنا مشکل ہے۔ لہٰذا ہر مترجم نے الگ الگ معنوں میں ترجمہ کیا جیسے جھڑ پڑیں گے (احمد رضاؒ) بے نور ہو جائیں گے (جوناگڑھیؒ)، بکھر جائیں گے (مودودیؒ)، میلے ہو جائیں گے (محمود حسنؒ)۔ غور سے دیکھا جائے تو دو ہی مفہوم سامنے آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ اس مقام پر نہ ہوں گے جہاں اب ہیں۔ دوسرے ان کا نور ختم ہو جائے گا۔ اوّل الذکر معنوں میں مودودیؒ اور احمد رضاؒ نے ترجمہ کیا جبکہ مؤخرالذکر معنوں میں جوناگڑھیؒ اور محمود حسنؒ نے کیا۔ تاروں کے لئے 'میلا ہونا' کے بالمقابل 'بے نور ہونا' مناسب ہے۔

پہلی چھ آیات دنیا کی تباہی کا منظر پیش کر رہی ہیں جس میں جانوروں کے جمع کئے جانے کا بھی ذکر ہے۔ یہ بات انسانی مشاہدہ میں آتی رہتی ہے کہ جب بھی کوئی بڑی مصیبت (سیلاب، زلزلہ وغیرہ) آتے ہیں تو تمام جانور ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اس سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ ایسی مصیبت ہو گی کہ تمام وحشی جمع ہو جائیں گے اور اس طرح خوف و دہشت میں مبتلا ہوں گے کہ کوئی کسی کو ایذا نہیں پہنچائے گا۔ اس آیت کی تفسیر میں صلاح الدین یوسفؒ (مفسر احسن البیان) نے لکھا "یعنی انھیں بھی قیامت والے دن جمع کیا جائے گا۔" اگرچہ یہ معنی مبنی بر حقیقت ہوں، اس مقام پر سیاق سے میل نہیں کھا رہے ہیں۔ کیونکہ ان آیات میں قیامت برپا ہونے سے قبل کی منظر کشی ہے۔

وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ میں سُجِّرَتْ، سَجَرَ سے ہے جس میں معنوں کی بوقلمونی موجزن ہے۔ اس کے معانی و مفاہیم اس طرح ہیں۔ تنور کو ایندھن سے گرم کرنا۔ پانی کا نہر کو بھرنا، سمندر کا جوش مارنا[11]، آگ میں شدت پیدا کرنے کے لئے کوئی چیز جھونک دینا[12] اس طرح ایک لفظ میں مفہوم اتنا وسیع ہے کہ اس سے مراد ایسا ایندھن بھی ہو سکتا ہے جو آگ کو بھڑکانے کے کام آئے اور ایسا سمندر بھی جس میں جوش اور تلاطم ہو۔ اور دنیا کے تمام آبی ذخیروں کا یکجا ہو جانے کے معنی بھی اس میں شامل ہے۔ اس مقام پر سمندروں کے جمع ہو جانے یا بھر جانے کے مقابلہ میں بھڑک جانا ہولناک منظر پیش کر رہا ہے۔

اس آیت میں احمد رضاؒ نے 'جب جہنم بھڑکایا جائے' سے جہنم کے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کیا جبکہ جہنم اردو میں بھی مؤنث ہی ہے۔

قیامت کے منظر کے بیان کے پہلو سے دیکھا جائے تو پہلی چھ آیات نفخہء اولیٰ کا منظر پیش کر رہی ہیں اور آیت وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ سے قیامت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مردوں کے زندہ ہونے کا تصور سیاق سے زیادہ میل کھا رہا ہے اگرچہ انسانوں کے مختلف گروہوں میں اُٹھنے سے ترجمہ کرنا بھی درست ہے۔ لیکن اس سیاق میں جبکہ لوگ دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کے حضور پیش ہوں گے اور

مواخذہ ہو گا اس وقت زندہ در گور لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کیوں ماری گئی۔اس طرح جسموں کو جانوں سے جوڑ دینے کے مفہوم میں ترجمہ کرنے سے دوسرے مرحلے کے شروع ہونے کا بھی اشارہ ملتا ہے۔اس کی تائید سورۃ الانفطار کے طرزِ بیان سے بھی ہوتی ہے جہاں یہی مضمون اختصار سے بیان کیا گیا اور دوسرا مرحلہ قیامت کا 'جب قبریں کھول دی جائیں گی' سے شروع کیا گیا۔اس سے مراد مردوں کا زندہ ہونا ہے۔لہٰذا اس محل پر یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ان معنوں میں مودودیؒ اور جوناگڑھیؒ نے ترجمہ کیا۔

وَإِذَا السَّمَاء كُشِطَتْ میں کَشَطَ کے معنی جانور کی کھال اتار دینے کے ہیں۔ لیکن یہاں استعارے کے طور پر بیان ہوا ہے۔اور ایک زبان کے استعارے کا دوسری زبان میں لفظی ترجمہ نہیں ہو سکتا اس کے لئے مفہوم پر مبنی ترجمہ زیادہ مناسب ہوتا ہے۔جوناگڑھیؒ اور محمود حسنؒ نے لفظی ترجمہ کیا جبکہ احمد رضاؒ اور مودودیؒ نے مرادی ترجمہ کیا۔یہاں استعارے کی زبان میں یہ بتلایا گیا کہ جس طرح جانور کی کھال ادھیڑنے سے اندرونی و مخفی چیزیں ظاہر ہو جاتی ہیں اسی طرح اس روز آسمانی مناظر وا کر دئے جائیں گے۔

مراحلِ قیامت

الْحَاقَّةُ مَاالْحَاقَّةُ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ (الحاقہ: 1تا3)

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ وَانشَقَّتِ السَّمَاء فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ وَالْمَلَكُ عَلَى أَرْجَائِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَى مِنكُمْ خَافِيَةٌ (الحاقہ: 13تا18)

وہ حق ہونے والی، کیسی وہ حق ہونے والی اور تم نے کیا جانا کیسی وہ حق ہونے والی۔۔۔۔پھر جب صور پھونک دیا جائے ایک دم،اور زمین اور پہاڑ اٹھا کر دفعتاً چُورا کر دیے جائیں،وہ دن ہے کہ ہو پڑے گی وہ ہونے والی اور آسمان پھٹ جائے گا تو اس دن اس کا پتلا حال ہو گا اور فرشتے اس کے کناروں پر کھڑے ہوں گے اور اس دن

تمہارے رب کا عرش اپنے اوپر آٹھ فرشتے اٹھائیں گے اس دن تم سب پیش ہو گے کہ تم میں کوئی چھپنے والی جان چھپ نہ سکے گی۔(احمد رضاؒ)

ثابت ہونے والی، ثابت ہونے والی کیا ہے اور تجھے کیا معلوم کہ ثابت شدہ کیا ہے؟۔۔۔پھر جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی اور زمین و پہاڑ اُٹھا لئے جائیں اور ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دئے جائیں گے۔اس دن ہو پڑنے والی ہو پڑے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن بالکل بودہ ہو جائے گا۔اس کے کناروں پر فرشتے ہوں گے اور تیرے پروردگار کا عرش اس دن آٹھ (فرشتے) اپنے اوپر اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔اس دن تم سب سامنے پیش کئے جاؤ گے۔تمہارا کوئی بھید پوشیدہ نہ رہے گا۔(محمد جوناگڑھیؒ)

ہونی شدنی! کیا ہے وہ ہونی شدنی؟اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے ہونی شدنی؟۔۔۔۔پھر جب ایک دفعہ صور میں پھونک ماردی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اُس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا اُس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی۔فرشتے اس کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اُس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے وہ دن ہو گا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے، تمہارا کوئی راز بھی چھپا نہ رہ جائے گا۔(مودودیؒ)

وہ ثابت ہو چکنے والی، کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی اور تو نے کیا سوچا کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی؟۔۔۔۔پھر جب پھونکا جائے صور میں ایک بار پھونکنا اور اُٹھائی جائے زمین اور پہاڑ پھر کوٹ دئے جائیں ایک بار۔اس دن ہو پڑے وہ ہو پڑنے والی اور پھٹ جائے آسمان پھر وہ اس دن بکھر رہا ہے اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر اور اُٹھائیں گے تخت تیرے رب کا اپنے اوپر اس دن آٹھ شخص۔اس دن سامنے کئے جاؤ گے چُھپی نہ رہے گی تمہاری کوئی چُھپی بات۔(محمود حسنؒ)

الْحَاقَّةُ مَا الْحَاقَّةُ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ کا ترجمہ ہونی شدنی، کیا ہے وہ ہونی شدنی، تم کیا جانو کیا ہے وہ ہونی شدنی؟ میں صوتی آہنگ کا ترجمہ میں خیال رکھا گیا۔جبکہ 'حق ہونے والی' یا 'ثابت ہونے والی' سے

ترجمہ کرنے میں کلام میں زور پیدا ہوا ہے اگرچہ آہنگ برقرار نہ رہا۔ جوناگڑھیؒ نے پہلی دو مرتبہ الْحَاقَّةُ کا ترجمہ 'ثابت ہونے والی' سے کیا اور تیسری مرتبہ 'ثابت شدہ' لکھا۔ یہاں پر یکسانیت برقرار رکھتے تو زیادہ اچھا ہوتا کیونکہ لفظ 'ثابت شدہ' گذر چکے واقعہ کے لئے بولا جاتا ہے۔

احمد رضاؒ نے مَاالْحَاقَّةُ کا ترجمہ 'کیسی وہ حق ہونے والی' سے کیا ہے۔ 'کیسی وہ ثابت ہونے والی' سے اس کے واقع ہونے کی کیفیت بتلانے پر زور ہے۔ جبکہ 'کیا ہے وہ ثابت ہونے والی' کے جملہ سے اس کے لازماً واقع ہونے اور بہت بڑی خبر کی اطلاع دینے کا مفہوم نکلتا ہے اور قرآن کے اسلوبِ بیان سے دوسرے معنوں میں ہی زیادہ مناسبت ہے۔ مزید برآں لفظ 'مَا' کے لئے 'کیا' ہی قریبی مفہوم ہے۔

نفخہ کے بعد زمین و آسمان کو ایک مرتبہ کوٹ دینے میں اور ایک ہی چوٹ میں ریزہ کر دینے میں فرق ہے۔ پہلے جملے میں زمین کا بالکل سپاٹ ہو جانے کا مفہوم نکلتا ہے اور دوسرے میں اس کی اصلی حالت بالکل تباہ ہو جانے کا مفہوم ہے۔ پہلے معنوں میں محمود حسنؒ نے ترجمہ کیا جبکہ باقی مترجمین نے دوسرے معنوں میں۔ یہاں ریزہ ریزہ ہو جانا نفخۂ اولیٰ کے حوالہ سے زیادہ میل کھا رہا ہے۔ قیامت کے روز اللہ کے حضور جب انسان کھڑے ہوں گے اس وقت تو زمین سپاٹ ہو گی۔ یہ حالت تمام لوگوں (ذی روح) کے خاتمہ کے بعد ہو گی اور اللہ اسے دوبارہ ایسا بنادے گا لیکن پہلے مرحلہ میں یہ بالکل تباہ ہو جائے گی جس کا یہاں بیان ہوا ہے۔

فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ کا ترجمہ تو اس دن اس کا حال پتلا ہو گا، بالکل بودا ہو جائے گا، اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی، پھر وہ اس دن بکھر رہا ہے، سے کیا گیا۔ اصل میں لفظ وَاهِيَةٌ آیا ہے جس کے بنیادی معنی کمزور ہونا ہے۔ عربی میں یہ لفظ وَهِيَ کسی چیز کا بوسیدگی کی وجہ سے کمزور ہونے پر بولا جاتا ہے[13]۔ اس کے معنی کسی چیز کا ڈھیلا پڑ جانا، اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو جانا[14] بھی ہیں۔ ان معنوں کی روشنی میں آسمان کا کمزور ہو جانا مراد ہے لیکن یہ انتہائی ناپائیدار یعنی بودا نہیں ہو گا بلکہ جس طرح کپڑا درمیان سے پھٹ کر بوسیدہ ہو جاتا ہے اس طرح اس کا حال ہو گا۔ اگلی آیت میں واضح ہے کہ فرشتے اس کے اطراف و جوانب

میں ہوں گے۔ محمود حسنؒ نے وَاهِيَةٌ کے لئے 'بکھر رہا ہے' سے ترجمہ کیا جو لغوی اور معنوی اعتبار سے کمزور معلوم ہوتا ہے اور حال کے صیغہ میں بھی ترجمہ ہوا ہے جبکہ یہاں مستقبل کا بیان ہے۔

مودودیؒ نے 'بندش' ڈھیلی پڑ جانے سے تعبیر کیا جو کہ حقیقت حال سے قریب تر ہے کیونکہ موجودہ علمی ترقیات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو آسمان دراصل مختلف قوتوں کا آپسی توازن اور بندش کے طور پر قائم ہے۔ جب یہ بندش ڈھیلی پڑ جائے گی تو اس کا وجود ختم ہو جائے گا اس لحاظ سے یہ علمی ترجمہ ہے۔

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ میں ثَمَانِيَةٌ کا ترجمہ آٹھ فرشتے اُٹھائیں گے، آٹھ (فرشتے)، آٹھ فرشتے، آٹھ شخص سے کیا گیا ہے۔ اس آیت میں لفظ ثَمَانِيَةٌ میں فرشتوں کے معنی محذوف ہیں۔ سبھی نے اس سے مراد فرشتے ہی لئے ہیں لیکن محمود حسنؒ نے 'آٹھ شخص' سے ترجمہ کیا۔ شخص کا لفظ اردو میں انسانوں یا افراد کے لئے بولا جاتا ہے۔ فرشتوں کے لئے 'شخص' کا لفظ نہیں بولا جاتا ہے۔ سب سے محتاط انداز میں جوناگڑھیؒ نے ترجمہ کیا انھوں نے مراد کو قوسین میں اس طرح لکھا 'آٹھ (فرشتے)'۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ میں اللہ کے سامنے پیش کئے جانے کا مفہوم چُھپا ہوا ہے۔ یہ عربی میں اسلوبِ حذف کے تحت آتا ہے جسے اہلِ زبان بخوبی سمجھتے ہیں۔ لیکن ترجمہ کرتے وقت حذف کو کھولنے سے ہی مفہوم مبرہن ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر 'رب کے سامنے' کا اضافہ کرنے سے ترجمہ میں مکمل فہم پیدا ہوتا ہے جسے ہم ترجمہ میں 'مطلوب مداخلت' کہہ سکتے ہیں۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ کا ترجمہ احمد رضاؒ نے 'پیش کئے جائیں گے' کے بجائے 'پیش ہوں گے' سے کیا جبکہ تُعْرَضُونَ مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔

لَا تَخْفَى مِنكُمْ خَافِيَةٌ کا ترجمہ احمد رضاؒ نے 'چھپنے والی جان چھپ نہ سکے گی' سے کیا۔ احمد رضاؒ کے سوا باقی مترجمین نے راز یا بھید کے نہ چھپنے کے معنوں میں کیا۔ یہاں کسی کے دلوں تک کی بات چھپ نہیں سکتی کے معنوں میں ترجمہ کرنا زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ انسانوں کے رب کے سامنے ہونے کا مفہوم 'تم سب پیش کئے جاؤ گے' میں آچکا ہے۔ اب کوئی ایسی بات ہو رہی ہے جو بظاہر انسانوں سے چُھپی ہوتی ہے لیکن

اس روز کوئی چھپی نہ رہے گی۔ شفیع صاحبؒ نے اس مقام پر ترجمہ سے الگ معنوں میں تفسیر کی۔ ان کی تفسیر میں انھوں نے کسی ایسی جگہ (جھاڑ، پہاڑ) کے وہاں ہونے کی تردید کی ہے جس کے پیچھے کوئی چُھپ سکے۔ یہ مفہوم بھی میدانِ حشر کی کیفیت بیان کر رہا ہے لیکن اس مقام پر رازوں یا دلوں کے مخفی حال تک کا منکشف ہو جانے کا مفہوم ابلغ ہے۔ ان کی تفسیر محمود حسنؒ کے ترجمہ کے بجائے احمد رضاؒ کے ترجمہ پر بہتر طور پر چسپاں ہوتی ہے۔

زندگی بعدِ موت

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَى لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (الزلزال)

جب زمین تھر تھرا دی جائے جیسا اس کا تھر تھرانا ٹھہرا ہے اور زمین اپنے بوجھ باہر پھینک دے اور آدمی کہے اسے کیا ہوا اس دن وہ اپنی خبریں بتائے گی اس لیے کہ تمہارے رب نے اسے حکم بھیجا اس دن لوگ اپنے رب کی طرف پھریں گے کئی راہ ہو کر تا کہ اپنا کیا دکھائیں جائیں تو، جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا، اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے اسے دیکھے گا۔ (احمد رضاؒ)

جب زمین پوری طرح جھنجھوڑ دی جائے گی اور اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔ انسان کہے گا کہ اسے کیا ہو گیا؟ اس دن زمین اپنی سب خبریں بیان کر دے گی اس لئے کہ تیرے رب نے اسے حکم دیا ہو گا۔ اس روز لوگ مختلف جماعتیں ہو کر واپس لوٹیں گے تا کہ انھیں ان کے اعمال دکھا دئے جائیں۔ پس جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے بھی ذرّہ برابر بُرائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔ (محمد جوناگڑھیؒ)

جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اِس کو کیا ہو رہا ہے اُس روز وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اُسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہو گا اُس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تا کہ اُن

کے اعمال اُن کو دکھائے جائیں پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ (مودودیؒ)

جب ہلا ڈالے زمین کو اس کے بھونچال سے اور نکال باہر کرے زمین اپنے اندر کے بوجھ اور کہے آدمی اس کو کیا ہو گیا۔ اس دن کہہ ڈالے گی وہ اپنی باتیں اس واسطے کہ تیرے رب نے حکم بھیجا اس کو۔ اس دن ہو پڑیں گے لوگ طرح طرح پر کہ ان کو دکھا دئے جائیں ان کے عمل۔ سو جس نے کی ذرّہ بھر بھلائی وہ دیکھ لے گا اسے اور جس نے کی ذرّہ بھر برائی وہ دیکھ لے گا اسے۔ (محمود حسنؒ)

آیت إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا کا ترجمہ احمد رضاؒ نے دو جملوں میں کیا جس میں زور اور شدّت ترجمہ میں منتقل نہ ہو پائی۔ جملے بہت سادہ ہیں جس میں کسی اہم واقعہ کے بیان کا اسلوب نہیں ملتا۔ مودودیؒ اور جوناگڑھیؒ نے کم الفاظ میں مکمل مفہوم ادا کیا۔ ان دو ترجموں میں بھی ہلکا سا فرق ہے۔ "پوری طرح جھنجوڑ دی جائے گی" میں ساری زمین کو ایک ساتھ ہلا دینے کا مفہوم ہے۔ لفظ 'جھنجھوڑنے' میں 'جھٹکا' نہیں ہے۔ یہ لفظ، زلزلہ کے مقابلہ میں ہلکا ہے اور مودودیؒ کے ترجمہ "پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی" میں زلزلہ کا زور آور ہونا اور زمین کا بھی پوری طرح ہل جانا، یہ دو مفہوم شامل ہیں۔ بہر حال یہ دونوں ترجموں میں شدت یا زور کے ساتھ مفہوم کی منتقلی ہوئی ہے۔

لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو زِلْزَالَهَا کا ترجمہ 'اس کے بھونچال سے' ہوتا ہے جو محمود حسنؒ کے ہاں ملتا ہے۔ لفظ بھونچال میں سختی و شدت کا پہلو بھی زیادہ ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا کے ترجمہ میں اختلاف رونما ہوا ہے۔ احمد رضاؒ نے 'کئی راہ ہو کر' کے الفاظ سے ترجمہ کیا اور اس سے انھوں نے مراد لیا کہ جنّتی لوگ سیدھی طرف سے اور جہنمی بائیں طرف سے اللہ کے حضور حاضر ہوں گے یعنی ان کی راہیں مختلف ہوں گی۔ جوناگڑھیؒ نے لکھا، 'مختلف جماعتیں ہو کر لوٹیں گے'۔ مودودیؒ نے 'متفرق حالت' اور محمود حسنؒ نے 'طرح طرح' سے ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ اس

آیت میں لوٹنے سے مراد مودودیؒ کے ہاں دنیا سے آخرت کی طرف لوٹنا ہے اور شفیع صاحبؒ نے موقفِ حساب سے انجام کی طرف لوٹنا مراد لیا ہے۔ احمد رضاؒ کی تفسیر میں اس کی وضاحت نہیں ہے۔ یوسف صاحبؒ نے دونوں امکانات نقل کئے اور أَشْتَاتًا کے لئے بھی تمام ممکنہ معنی تفسیر میں نقل کئے یعنی وہ لوگ متفرق حالت میں یا مختلف گروہوں میں یا مختلف جوانب میں ہوں گے۔ لیکن مودودیؒ نے لفظ أَشْتَاتًا کے لئے متفرق یا گروہ در گروہ کے معنوں کو چھوڑ کر دوسرے معنی مراد لینا لفظ کی معنوی حدود سے باہر بتلایا ہے اور اس کے استدلال میں قرآن کی وہ آیات نقل کیں جن میں یہ معنی بیان ہوئے[15]۔

دوسرے معنوں میں جوناگڑھیؒ نے ترجمہ کیا 'مختلف جماعتوں میں' یہ بھی سیاق کے لحاظ سے پوری طرح منطبق ہوتا ہے کیونکہ لفظ شَتَّى ایک قسم کے مجموعوں کے لئے بھی آتا ہے۔ اس طرح نیک و بد لوگ بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں جیسا کہ سورۃ الواقعہ میں قیامت کے روز تین گروہوں میں لوگوں کے حاضر ہونے کا بیان ہے: سابقون الاولون، اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال۔ یہ تمام امکانات قیامت کے روز ممکن ہیں لیکن ہمیں قرآن کے طرزِ بیان یا سلسلہ بیان سے یہ دیکھنا ہے کہ اس مقام پر یہ لوٹنا کن معنوں پر مکمل منطبق ہوتا ہے۔ اس کا جواب اگلے فقرہ لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ سے ملتا ہے۔ یعنی ان کو ان کے اعمال دکھانے کے لئے یہ واپسی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ 'لوٹنا' موقف حساب سے پہلے کا لوٹنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حساب کتاب ہونے کے بعد 'اعمال' کا دکھایا جانا بے محل معلوم ہوتا ہے۔ جنھوں نے اس کے معنی 'موقفِ حساب سے لوٹنا' مراد لئے ہیں انھوں نے أَعْمَالَهُمْ کے لئے بھی 'اعمال کے ثمرات' یعنی جزا و سزا دکھانے کا مفہوم شامل کیا یعنی جنّت و جہنم۔ مودودیؒ نے اپنے موقف کے دفاع میں لکھا ہے: "اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں، یعنی ہر ایک کو یہ بتایا جائے کہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے دوسرے یہ کہ ان کو ان کے اعمال کی جزا دکھائی جائے اگرچہ یہ دوسرے معنی بھی لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ کے لئے لئے جا سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے لِّيُرَوْا جَزَاءَ أَعْمَالِهِمْ نہیں فرمایا بلکہ لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ فرمایا ہے اس لئے پہلے معنی ہی قابل ترجیح ہیں۔"

اس طرح عربی الفاظ اور سلسلہ ءکلام دونوں سے ہی اس بات کا قوی امکان نظر آتا ہے کہ لوگ اللہ کے حضور مختلف حالتوں میں قبروں سے نکل کر موقفِ حساب کی جانب چل دیں گے۔ پھر وہاں انھیں ان کے وہ تمام اعمال دکھائے جائیں گے جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔

حوالہ جات

[1] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء

[2] ایضاً

[3] القاموس الجدید، کتب خانہ حسینیہ، 2014ء، ص 251

[4] المنجد، فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمٹیڈ (دہلی)

[5] سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 2011ء، جلد ششم، ص 459

[6] المنجد، فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمٹیڈ (دہلی)

[7] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء

[8] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء

[9] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء

[10] المنجد، فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمٹیڈ (دہلی)

[11] المنجد، فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمٹیڈ (دہلی)

[12] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء

[13] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء

[14] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء

[15] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 2011ء، جلد ششم، ص 423

باب ہفتم

قرآنی احکامات کے تراجم کا تقابلی مطالعہ

تمہید

قرآن کریم میں احکامات نہایت واضح ہیں۔ صاف صاف بیان کئے گئے ہیں۔ ایسی آیات کے تراجم میں اختلاف شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ لیکن ترجمہ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ تشریح طلب ہوتی ہے۔ اکثر مفسرین کے ہاں تفسیر میں اختلاف مل سکتا ہے لیکن ترجمہ عموماً ایک ہی ہے۔ یہ دراصل قوانین اور احکام کی تشریح میں مختلف رائے رکھتے ہیں اور احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔

اس قسم کی آیات دراصل تشریح طلب ہوتی ہیں اگرچہ مدّعا واضح ہوتا ہے اور احکامات پر عمل کرنے کے لئے طرح طرح کی مسائل کے ادراک اور تدارک میں علماء مختلف نظر آتے ہیں۔

اس طرح اس موضوع کا تقابلی مطالعہ کرتے وقت یہ مشکل درپیش ہے کہ ترجمہ میں کوئی اختلاف نہ ہونے کے باوجود تفاسیر میں احکام کی نوعیت و حدود میں اختلاف نظر آتا ہے۔ میں نے ترجمہ پر ہی زور دیا ہے۔ تفسیری حواشی کا اثر اگر ترجمہ پر ہوا ہے تب ہی اس تفسیری حواشی کو تقابلی مطالعہ میں شامل کیا ہے۔

اس موضوع کے تحت قرآن میں بیان کردہ عبادات، معاشرتی احکامات، معاشی احکامات و سیاسی احکامات سے متعلق ایک ایک نمونے کا انتخاب کرکے اس کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جو موضوعات میں نے منتخب کیے وہ نماز (عبادات کے ضمن میں)، پردہ (معاشرت)، سود (معاشی نظام) اور جہاد کا موضوع سیاسی نظام کے تحت لیا ہے۔

تقابلی مطالعہ اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

نماز

أَقِمِ الصَّلاَةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ عَسَى أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا (بنی اسرائیل:78،79)

نماز قائم رکھو سورج ڈھلنے سے رات کی اندھیری تک اور صبح کا قرآن بیشک صبح کے قرآن میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور رات کے کچھ حصہ میں تہجد کرو یہ خاص تمہارے لیے زیادہ ہے، قریب ہے کہ تمہیں تمہارا رب ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں۔(احمد رضاؒ)

نماز کو قائم کریں آفتاب کے ڈھلنے سے رات کی تاریکی تک اور فجر کا قرآن پڑھنا بھی۔یقیناً فجر کے وقت کا قرآن پڑھنا حاضر کیا گیا ہے۔رات کے کچھ حصّے میں تہجّد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کریں۔یہ زیادتی آپ کے لئے ہے۔عنقریب آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود میں کھڑا کریگا۔(محمد جوناگڑھیؒ)

نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے اور رات کو تہجد پڑھو، یہ تمہارے لیے نفل ہے، بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کردے۔(مودودیؒ)

قائم رکھ نماز کو سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا، بے شک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو اور کچھ رات جاگتا رہ قرآن کے ساتھ یہ زیادتی ہے تیرے لئے۔قریب ہے کھڑا کردے تجھ کو تیرا رب مقامِ محمود میں۔(محمود حسنؒ)

أَقِمِ الصَّلاَةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ میں دُلُوكِ الشَّمْسِ کے معنی مترجمین نے آفتاب ڈھلنے یا زوالِ آفتاب لیے ہیں۔مولانا عمر احمد عثمانی نے دُلُوكِ الشَّمْسِ کے ممکنہ معنی اس طرح بیان کیے "دُلُوك کے بنیادی معنی ہٹ جانا، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا، آہستگی و نرمی سے کھسک جانا ہیں۔علمائے لغت نے زوالِ آفتاب کو بھی دُلُوكِ الشَّمْس کہا، آفتاب کے زرد ہونے کو بھی دُلُوكِ الشَّمْس کہا اور آفتاب کے

غروب ہونے کو بھی کیونکہ ان تینوں صورتوں میں محسوس طریقہ پر آفتاب اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے"[1]۔

اس آیت کے ترجمہ میں چاروں مترجمین نے لِدُلُوك کے 'ل' کا ترجمہ بمعنی 'مِن' کیا ہے جسکی وجہ سے ترجمہ میں چار اوقات کا مفہوم نکالنا مشکل ہے۔اس کے بجائے اگر 'ل' کے معنی 'عند' یا 'بعد' سے کئے جائیں تو ترجمہ ہوگا دلوکِ شمس کے وقت یا دلوکِ شمس کے بعد جیسا کہ ڈاکٹر محی الدین غازی نے ابن عاشور کا قول نقل کیا کہ "والام فی (لدلوک الشمس)لام التوقیت وھی بمعنی عند"۔اس طرح اس آیت کے معنی ہوں گے "نماز قائم کرو سورج کے ڈھلنے پر(یا زوال کے اوقات میں)شب کے تاریک ہونے تک نماز قائم کیجئے[2]۔

مولانا عمر احمد عثمانی نے اس آیت کا متبادل ترجمہ اس طرح پیش کیا ہے "نماز قائم کیجئے دلوکِ شمس کی بناپر رات کے پھیل جانے تک۔اس طرح ان کا کہنا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کی علّت انتقالِ شمس ہے اور یہ انتقالات چار ہیں جو عام آدمی بھی محسوس کر سکے۔زوالِ آفتاب پہلا انتقال شمس ہے جب ظہر فرض ہوتی ہے،دوسرا جب آفتاب میں زردی آجائے اور آفتاب بالکل نگاہوں کے سامنے آجائے جسے ہم سہ پہر کہتے ہیں اس وقت عصر فرض ہو جاتی ہے، تیسرا انتقالِ غروب ہو جانے پر ہے جبکہ مغرب فرض ہوتی ہے، چوتھا انتقالِ شمس اس وقت ہے جب آفتاب کے اثرات بالکلیہ ختم ہو جاتے ہیں اس وقت عشاء کی نماز فرض ہے"[3]۔انھوں نے دلوکِ شمس کی اصطلاح جوں کی توں برقرار اس وجہ سے رکھی کہ اردو میں ان چاروں اوقات کے اظہار کا بہتر متبادل ملنا مشکل ہے۔

اس مقام پر اس بحث کو شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ 'ل' کا ترجمہ 'مِن' کے بجائے 'فی' یا لامِ توقیت سے کیا جائے تو ترجمہ میں زیادہ وسعت پیدا ہوتی ہے اور انتقالِ شمس کی بناپر چار اوقات کا اشارہ بھی ملتا ہے۔اس طرح بسا اوقات بعض مترجمین کی نظر اس طرح کی باریکیوں سے چوک جاتی ہے جہاں دوسرے لوگ پہنچ جاتے ہیں۔

قُرْآنَ الْفَجْرِ کے لئے احمد رضاؒ نے صبح کا قرآن سے ترجمہ کیا۔اس کے لئے 'فجر کا قرآن' زیادہ مناسب ترجمہ ہے اس لئے کہ فجر اردو میں بھی مستعمل ہے اور صبح کے لفظ کا اطلاق طلوعِ آفتاب کے لئے بھی ہوتا ہے۔إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا کے ترجمہ میں جوناگڑھیؒ نے فجر کے وقت کا قرآن پڑھنا سے ترجمہ کیا جس کا اطلاق نماز سے فراغت کے بعد محض تلاوتِ قرآن پر بھی ہو سکتا ہے۔ جبکہ قرآنِ فجر (مودودیؒ) یا 'قرآن پڑھنا فجر کا' (محمود حسنؒ) سے نماز میں قرآن پڑھنے کے معنی نکلتے ہیں۔ مودودیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہاں فجر کے قرآن سے مراد فجر کی نماز ہے۔ قرآن میں نماز کے لئے کہیں تو صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور کہیں اس کے مختلف اجزاء میں سے کسی جُز کا نام لے کر پوری نماز مراد لی گئی ہے۔ مثلاً تسبیح ، حمد، ذکر، قیام، رکوع، سجود وغیرہ۔اس طرح یہاں فجر کے وقت قرآن پڑھنے کا مطلب محض قرآن پڑھنا نہیں بلکہ نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔اس طریقے سے قرآن نے ضمناً اشارہ کر دیا کہ نماز کن اجزاء سے مرکب ہونی چاہئے[4]۔

اس آیت میں لفظ مَشْهُودًا کے لئے بھی مختلف ترجمے ہوئے: حاضر کیا گیا، مشہود ہوتا ہے، روبرو کیا گیا۔احمد رضاؒ نے 'فرشتے حاضر ہوتے ہیں' سے مرادی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بظاہر لفظ مَشْهُودًا کی معنوی حدود سے باہر ہے لیکن مشہود ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ اس کے گواہ فرشتے بنتے ہیں۔ جبکہ 'حاضر کیا گیا' یا 'روبرو کیا گیا' میں مفہوم واضح نہیں ہے۔ مودودیؒ نے قرآنی اصطلاح 'مشہود' ہی ترجمہ میں برتی ہے۔

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ میں مِنَ اللَّيْلِ رات کے کچھ حصّے یا ایک حصّے کی طرف دلالت کرتا ہے۔ مودودیؒ نے 'رات کو' تہجد پڑھو سے ترجمہ کیا البتہ تفسیر میں لکھا ہے کہ رات کا ایک حصّہ سو کر اُٹھنے کے بعد تہجد پڑھنا چاہئے۔ اگر ترجمہ میں بھی 'کچھ حصّے' کا اضافہ کرتے تو بہتر ہوتا۔

اس مقام پر مودودیؒ اور احمد رضاؒ نے بِهِ کی ضمیر کا مرجع ترجمہ میں واضح نہیں کیا۔اس فقرے کا مکمل ترجمہ محمود حسنؒ نے کیا۔ چونکہ یہاں 'ہ' کی ضمیر قرآن کی طرف ہے اس لئے 'اس کے ساتھ' کے بجائے 'قرآن کے ساتھ' لکھا۔ اور فَتَهَجَّدْ کا بھی ترجمہ 'جاگتا رہ' سے کیا۔ باقی مترجمین نے 'تہجد پڑھو'

لکھا۔ جوناگڑھیؒ نے 'رات کے کچھ حصّے میں تہجد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کریں' سے تفسیری ترجمہ کیا۔ اس طرح اس فقرے کا مکمل اور جامع ترجمہ محمود حسنؒ کا ہے۔

نَافِلَةً لَّكَ کا ترجمہ خاص تمہارے لئے زیادہ ہے، یہ زیادتی آپ کے لئے ہے، یہ تمہارے لئے نفل ہے، یہ زیادتی ہے تیرے لئے سے کیا گیا ہے۔ اس آیت میں مفسرین کے مختلف رائیں سامنے آتی ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ زیادتی زائد فرض کے معنوں میں ہے۔ یعنی آپ کے لئے فرض ہے جبکہ اُمّت کے لئے نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ زیادہ ان معنوں میں ہے کہ آپ ﷺ کو بلند درجات عطا فرمائے جائیں۔ کیونکہ نفل امت کے لئے گناہوں کا کفّارہ ہو سکتے ہیں لیکن نبی مغفور الذنب ہیں اس لئے یہ زیادہ عبادت آپ کے درجات بلند کرے گی۔ تیسری رائے یہ ہے کہ تہجد کی نماز نبی ﷺ اور امت دونوں کے لئے نفل ہے۔ نَافِلَةً کے لفظی معنی زیادہ ہی ہیں جبکہ نَفَلَ بڑھانے کے لئے آتا ہے[5]۔ اس طرح یہاں تینوں مطالب کی گنجائش ہے۔ کنزالایمان میں پہلی رائے اختیار کی گئی، معارف میں دوسری رائے کو ترجیح دی گئی اور مودودیؒ نے نَافِلَةً کو نفل کے معنوں میں ہی لیا ہے۔ اور اپنے رائے کی دفاع میں لکھتے ہیں کہ نفل کے معنی ہی 'فرض سے زائد' ہیں جس سے خود بہ خود یہ اشارہ نکل آتا ہے کہ یہ نماز اوّل الذکر پانچ فرض نمازوں سے زائد ایک نفل ہے۔

مَقَامًا مَّحْمُودًا کا احمد رضاؒ نے تشریحی ترجمہ کیا، باقی سب نے اصل اصطلاح باقی رکھی۔ مودودیؒ کے علاوہ سبھی نے يَبْعَثَكَ کا ترجمہ 'تمہیں کھڑا کردے گا' سے کیا جبکہ مودودیؒ نے 'فائز کردینے' سے ترجمہ کیا جو ابلغ ہے۔ کسی مقام پر کھڑا کردینے میں اختیارات عطا ہونے کا پہلو نہیں ہے جبکہ فائز کرنے میں کسی عہدہ یا ذمہّ داری یا اختیارات کا پہلو شامل ہے۔ تینوں مفسرین نے اس سے قیامت کے دن شفاعتِ عظمیٰ کا مقام عطا ہونا مراد لیا ہے جبکہ مودودیؒ اس کو دنیا و آخرت میں لائقِ تحسین یا محمودِ خلائق ہونے پر محمول کرتے ہیں۔ انھوں نے شفاعتِ عظمیٰ کو بھی اس مقامِ محمود کے ایک حصّے کے طور پر بیان کیا ہے۔

جہاد

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيراً وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ (الحج: 40،39)

پروانگی عطاہوئی انہیں جن سے کافر لڑتے ہیں اس بناءپر کہ ان پر ظلم ہوااور بیشک اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے، وہ جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اتنی بات پر کہ انہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے اور اللہ اگر آدمیوں میں ایک کو دوسرے سے دفع نہ فرماتا تو ضرور ڈھادی جاتیں خانقاہیں اور گرجااور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت نام لیا جاتا ہے، اور بیشک اللہ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس کے دین کی مدد کرے گا بیشک ضرور اللہ قدرت والا غالب ہے۔(احمد رضاؒ)

جن (مسلمانوں) سے (کافر) جنگ کر رہے ہیں انھیں بھی مقابلہ کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ بیشک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ ہیں جنھیں ناحق اپنے گھروں سے نکالا گیا۔ صرف ان کے اس قول پر کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے اور گرجے اور مسجدیں اور یہودیوں کے معبد اور وہ مسجدیں بھی ڈھادی جاتیں جہاں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے۔ جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑی قوتوں والا بڑے غلبے والا ہے۔(محمد جوناگڑھیؒ)

اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجااور

معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔(مودودیؒ)

حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ وہ لوگ جن کو نکالا ان کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے توڈھائے جاتے تکئے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت۔ اور اللہ مقرر مدد کرے گا اس کی جو مدد کرے گا اس کی۔ بیشک اللہ زبردست ہے زور والا۔(محمود حسنؒ)

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ کے ترجمہ میں احمد رضاؒ اور محمود حسنؒ نے لفظ 'کافر' کا اضافہ کیا اگرچہ اس سے مراد کافر ہی ہیں۔ لیکن عربی متن میں یہ لفظ نہیں آیا ہے۔ جوناگڑھیؒ نے لِلَّذِينَ اور يُقَاتَلُونَ سے کون لوگ مراد ہیں اس کی وضاحت قوسین میں مسلمانوں اور کافر سے کی، یہ طریقہ زیادہ واضح اور محتاط ہے۔ مودودیؒ نے 'اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے' سے ترجمہ کیا جو اصل متن سے کُلی مطابقت رکھتا ہے اور مفہوم میں بھی واضح ہے۔

بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا کے لئے 'اس بنا پر کہ ان پر ظلم ہوا' اصل متن سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے جو احمد رضاؒ اور محمود حسنؒ نے کیا۔ اس آیت میں لفظ أُذِنَ کے لئے محمود حسنؒ نے حکم کے معنوں میں ترجمہ کیا باقی سب نے اسے اجازت کے معنوں میں لیا ہے۔ یہی معنی زیادہ قوی ہیں کیونکہ یہ قتال کے متعلق پہلی آیت ہے جس میں لڑنے کی اجازت ہی دی گئی۔ علاوہ ازیں أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ۔۔۔الخ (نساء: 77) میں قتال کی ممانعت تھی۔ اب اس آیت سے وہ ممانعت اٹھالی گئی اور لڑنے کی اجازت عطا کی گئی۔ جہاد کا حکم 2 ہجری میں ہوا تو اس کی تعمیل میں جنگ بدر ہوئی۔ لہٰذا یہاں پر اجازت سے ترجمہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔

وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِير کے لئے درج ذیل تراجم آئے:

اور بیشک اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے، بیشک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے، اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ عربی میں إِنَّ کے ساتھ لامِ تاکید داخل ہوتا ہے تو تاکید دوہری ہو جاتی ہے۔ اس کا ترجمہ میں برتنا مشکل ہے۔ اگر دوہری تاکید کا مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو اردو محاورہ متاثر ہوتا ہے۔ اگر اردو محاورہ کا خیال رکھا جائے تو دوہری تاکید ترجمہ میں نہیں آسکتی جیسا کہ مودودیؒ اور جوناگڑھیؒ کے ترجمہ میں ظاہر ہے۔ تاہم ان کے ترجمہ میں جملہ کے سلاست کو باقی رکھتے ہوئے تاکیدی پہلو کو بھی ایک حد تک برقرار رکھا گیا۔ محمود حسنؒ کا ترجمہ تاکیدی پہلو سے خالی ہے۔ انھوں نے بالکل سادہ جملہ میں ترجمہ کیا۔ جبکہ یہاں تاکید کا ترجمہ میں برتنا اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہاں یہ جملہ اس بات کو یقینی طور پر حزبِ مخالف کے ذہن میں بٹھانے کے لئے آیا ہے کہ مسلمانوں کی کم تعداد تمہیں اس دھوکے میں نہ رکھے کہ تم فتح پا جاؤ گے۔ ان کی پشت پر اصل نگہبان اللہ ہے جو ان کی مدد فرمائے گا اور تمہاری طاقت اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے یہاں دوہری تاکید عربی میں ہی ممکن ہے جو جملے کی روانی اور خوبصورتی کے ساتھ ہے۔

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيراً کے لئے جوناگڑھیؒ کے ترجمہ میں لفظ 'مسجدیں' دو مرتبہ آیا ہے۔ ایک یہودیوں کے معبد سے قبل آیا جو اصل متن میں نہیں ہے اور دوسرے فقرے 'اور وہ مسجدیں جہاں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے' میں اندازِ بیان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ذکر اللہ کا اطلاق صرف مسجدوں پر ہے۔ دوسروں کے تراجم میں جو مفہوم ہے وہ اس طرح ہے کہ تمام عبادت خانوں میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے جس کی توضیح تفسیر میں بھی ملتی ہے۔ مودودیؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک گروہ کو دائمی اقتدار ملتا تو دوسروں کے قلعے، قصر و ایوان ہی نہیں بلکہ عبادت گاہیں تک دست درازی سے نہ بچتیں۔ مفسّر معارف القرآن لکھتے ہیں:

"اگر اللہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کے ہاتھ سے زور نہ گھٹواتا رہتا یعنی اہلِ حق کو اہلِ باطل پر غالب نہ کرتا رہتا تو اپنے اپنے زمانے میں نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے"۔

مزید لکھتے ہیں:

"ان میں ان عبادت گاہوں کا ذکر نہیں جن کی بنیاد کسی وقت بھی نبوّت اور وحی الٰہی پر نہیں تھی جیسے آتش پرست مجوسی یا بُت پرست ہندو کیونکہ ان کے عبادت خانے کسی بھی وقت قابلِ احترام نہ تھے"۔

اس تفسیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام عبادت خانوں کو آپ اللہ کے ذکر کا گھر مراد لیتے ہیں۔

جوناگڑھیؒ نے صَوَامِعُ کے لئے لفظ 'عبادت خانے' ترجمہ میں اختیار کیا اس میں عبادت خانے کے نجی ہونے کا مفہوم ہے جو کہ عیسائیوں میں راہبوں کے لئے ہوتے تھے۔ لیکن راہب صَوَامِع میں صرف عبادت نہیں کرتے بلکہ ان کا مستقل قیام وہیں ہوتا تھا۔ اس کا ترجمہ مودودیؒ اور احمد رضاؒ نے 'خانقاہوں' سے کیا جبکہ خانقاہیں اس دور میں دوسرے معنوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ لفظ 'تکئے' 'فقیروں کے رہنے کی جگہ [6] کے لئے آتا ہے۔ جس میں مستقل قیام کا مفہوم ہے لیکن یہ نجی عبادت خانے نہیں ہیں۔ اس لفظ کا رواج بھی مسلمانوں میں ہے عیسائیوں میں نہیں۔ صَوَامِع کا بہتر متبادل 'راہب کی کٹیا' ہو سکتا ہے۔ اس ترجمہ میں عیسائی عبادت خانہ، نجی ہونے کا مفہوم اور مستقل قیامگاہ ہونے کا مفہوم تینوں شامل ہیں۔

بِيَعٌ کے معنی عیسائیوں کی عبادت گاہیں جسے اُردو میں گرجا کہتے ہیں۔ اس لفظ کے لئے جوناگڑھیؒ نے 'گرجے اور مسجدیں' سے ترجمہ کیا جبکہ محمود حسنؒ نے اس لفظ کے لئے 'مدرسے' کا استعمال کیا۔ اردو طبقہ میں مدرسہ کا ایک الگ مفہوم ہے۔ یہاں پر 'مدرسہ' سے ترجمہ کرنے میں اسے عبادت گاہ کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اسے ہم مترجم کی فکر کا ترجمہ پر اثر کہہ سکتے ہیں۔ محمود حسنؒ کے ترجمہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ ان کی اختیار کی گئی تمام اصطلاحات میں کہیں بھی یہودی یا عیسائی عبادت گاہوں کا مفہوم نہیں نکلتا۔

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ میں مَن يَنصُرُهُ کا احمد رضاؒ نے تفسیری ترجمہ کیا۔'جو مدد کرے گا اس کی' کے بجائے 'جو اللہ کے دین کی مدد کرے گا' سے کیا۔ مودودیؒ نے 'اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے'، جوناگڑھیؒ نے 'جو اللہ کی مدد کرے' سے کیا۔ اللہ کی مدد کرنے سے کیا مراد ہے یہ تشریح طلب بات ہے جسے تفسیر معارف القرآن اور تفہیم القرآن میں اللہ کے دین کی مدد کے معنوں میں سمجھایا گیا۔ اس طرح احمد رضاؒ نے ترجمہ میں ہی مراد کو واضح کیا۔ البتہ 'دین کی مدد' قوسین میں لکھتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

یہاں اللہ کے دین کی مدد سے مراد اس دین کو قائم کر کے تمام ادیان پر غالب کرنا ہے تاکہ امن و سکون قائم ہو سکے، چونکہ یہاں مدد جہاد کے سیاق میں آیا ہے تو یہاں مراد وہی ہے جو الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ۔۔۔الخ[7] اور إِذَا جَاء نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ۔۔۔الخ[8] سے ظاہر ہے۔

قتال کا حکم

وَقَاتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبِّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلاَ تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاء الْكَافِرِينَ ۝ فَإِنِ انتَهَوْاْ فَإِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّهِ فَإِنِ انتَهَواْ فَلاَ عُدْوَانَ إِلاَّ عَلَى الظَّالِمِينَ ۝

(البقرہ:190تا193)

اور اللہ کی راہ میں لڑو ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ پسند نہیں رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو اور کافروں کو جہاں پاؤ مارو اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور ان کا فساد تو قتل سے بھی سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو جب تک وہ تم سے وہاں نہ لڑیں اور اگر تم سے لڑیں تو انہیں قتل کرو کافروں کی یہی سزا ہے، پھر اگر وہ باز رہیں تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور ان سے لڑو

یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور ایک اللہ کی پوجا ہو پھر اگر وہ باز آئیں تو زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔(احمد رضاؒ)

لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔انہیں مارو جہاں بھی پاؤاور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تمہیں نکالا اور (سنو) فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے لڑائی نہ کرو جب تک کہ یہ خود تم سے نہ لڑیں،اگر یہ تم سے لڑیں تو تم بھی انھیں مارو، کافروں کا بدلہ یہی ہے۔اگر یہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ان سے لڑو جب تک کہ فتنہ نہ مٹ جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ آجائے،اگر یہ رُک جائیں (تو تم بھی رُک جاؤ) زیادتی تو صرف ظالموں پر ہی ہے۔(محمد جوناگڑھیؒ)

اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا اُن سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے،اس لیے کہ قتل اگرچہ بُرا ہے، مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں، تم بھی نہ لڑو، مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چُوکیں، تو تم بھی بے تکلف انہیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔پھر اگر وہ باز آجائیں، تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر وہ باز آجائیں، تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔(مودودیؒ)

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کرو بے شک اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو اور مار ڈالو ان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو ان کو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا۔ اور دین نے بچلانا مار ڈالنے سے زیادہ سخت ہے۔اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ، پھر اگر وہ خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مارو یہی ہے سزا کافروں کی۔پھر اگر وہ باز آئیں تو بے

شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے اور لڑو ان سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے خدا تعالیٰ کا پھر اگر وہ باز آجائیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔ (محمود حسنؒ)

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ میں قرآنی متن میں حزبِ مخالف کا نام نہیں لیا گیا۔ احمد رضاؒ نے 'اور کافروں کو جہاں پاؤ مارو' میں لفظ 'کافروں' کو ترجمہ میں ہی شامل کیا اگرچہ یہاں مراد کافر ہی ہیں لیکن اسلوبِ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے ایسے کافر جو تم سے لڑتے ہیں۔ کیونکہ وَاقْتُلُوهُمْ میں هُمْ کی ضمیر الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ کی طرف لوٹ رہی ہے۔۔ جوناگڑھیؒ اور محمود حسنؒ نے علی الترتیب 'انھیں مارو' اور 'مار ڈالو ان کو' سے ترجمہ کیا۔ مودودیؒ نے 'ان سے لڑو' کے الفاظ استعمال کئے۔ یہاں 'لڑنے' کے مقابلہ میں 'مار ڈالو' اصل متن سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ لفظ 'مارو' مار ڈالنے یا قتل کرنے کے مقابلہ میں ہلکا ہے۔ مارنے میں وہ مفہوم نہیں ہے جو مار ڈالنے میں ہے۔ 'قتل کرو' بہتر ترجمہ ہے۔ علاوہ ازیں، مودودیؒ نے قَاتَلَ (سے قَاتِلُوْا) اور قَتَلَ (سے وَاقْتُلُوهُمْ) دونوں کا ترجمہ لڑنے کے معنوں میں کیا جبکہ اول الذکر لفظ کے معنی لڑنے اور مؤخر الذکر لفظ کے معنی قتل کرنے یا مار ڈالنے کے ہیں۔

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ کا ترجمہ اور ان کا فساد تو قتل سے بھی سخت ہے، اور فتنہ قتل سے بھی سخت ہے، اس لئے کہ قتل اگرچہ بُرا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے اور دین نے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے سے کیا گیا۔ اس آیت میں احمد رضاؒ نے فِتْنَةُ کے لئے 'ان کا فساد' سے ترجمہ کیا حالانکہ یہاں فساد کو کسی سے نسبت نہیں دی گئی بلکہ یہ فساد عام ہے۔ اس کو 'ان کے فساد' سے مخصوص کرنے سے اصل متن کی عمومیت متاثر ہوئی۔ اس مقام پر فتنہ سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت کے بغیر مکمل مفہوم قاری کے لیے سمجھنا مشکل ہے، محمود حسنؒ نے 'دین نے بچلانا' شائد 'دین کو بدلنا' کے معنوں میں لکھا ہے، اس طرح یہ persecution یعنی دین بدلنے پر مجبور کرنے کے معنی دیتا ہے۔ جو سیاق سے گہری مناسبت رکھتا ہے۔ کنزالایمان کے مفسر نے شرک اور مسلمانوں کو مکہ میں داخلہ سے روکنے کو فتنہ کہا اور احسن البیان کے مفسر

نے یہاں فتنہ سے مراد کفر و شرک لیا ہے ،مودودیؒ کے نزدیک کفر و شرک نہیں بلکہ قبولِ حق سے جبراً روکنا فتنہ ہے اور معارف القرآن میں محمد شفیعؒ نے کفارِ مکہ کا کفر و شرک پر جمے رہنا اور مسلمانوں کو ادائے عبادت حج و عمرہ سے روکنا، فتنہ کی تعریف میں لیا ہے جبکہ اشرف علی تھانویؒ کے مطابق "فتنہ سے مراد شرارت ہی ہے کیونکہ قتل و اخراج کی نوبت ان کی شرارت کی وجہ سے ہی نکلتی ہے"۔

آیت کا مکمل مطالعہ سے اسی موقف کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں فتنہ دین کے معاملہ میں ظلم و زیادتی یا persecution کے ضمن میں آیا ہے۔ جیسا کہ اسی آیت میں 'انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تمہیں نکالا ہے' سے ظاہر ہے۔ اسی طرح قرآن میں دوسرے مقامات جیسے سورہ حج کی آیت 40 میں بھی بتایا گیا کہ تمہیں قتال کی اجازت دی جاتی ہے اس بنا پر کہ تم پر ظلم ہوا۔ آگے اس ظلم کی صراحت اس طرح کی گئی کہ "انھیں ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا صرف اس لیے کہ انھوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے"۔ سورہ البقرہ آیت 217 میں بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ یہی وہ وجہ معلوم ہوتی ہے جسے قتل سے بھی سخت کہا گیا اور اسی بنا پر لڑنے کی جازت دی گئی اور آگے بھی اسی فتنہ کے ختم ہونے تک لڑائی جاری رکھنے کا حکم ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّهِ کا ترجمہ کچھ اس طرح آیا ہے:

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور ایک اللہ کی پوجا ہو، ان سے لڑو جب تک کہ فتنہ نہ مٹ جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ آجائے، تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے، اور لڑو ان سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے خدا تعالیٰ کا۔

اس آیت میں مطابقت کے حوالہ سے مودودیؒ نے کُلی مطابقت سے ترجمہ کیا جبکہ جوناگڑھیؒ نے مفہوم پر مبنی ترجمہ کیا۔ جوناگڑھیؒ کے ترجمہ سے دین کے غلبہ تک لڑائی جاری رکھنے کا مفہوم نکلتا ہے جبکہ احمد رضاؒ نے ترجمہ میں دین کا مطلب پوجا لیا جو نجی یا انفرادی معاملہ تک محدود ہے۔ مودودیؒ نے 'دین اللہ کے لئے ہو جانے' سے مراد ایسی حالت کا قیام لیا ہے جہاں بندے قانونِ الٰہی کے مطیع بن کر رہیں یعنی نظامِ

حق کا قیام مراد ہے۔اس طرح یہ بھی دین کے غلبہ کے مترادف ہے۔اس طرح اللہ کے دین کے قیام کے معنی مودودیؒ نے تشریح میں واضح کئے لیکن یہ وضاحت جوناگڑھیؒ کے ترجمہ میں ہی ہے۔ محمود حسنؒ کے ترجمہ سے اللہ کے احکامات کی بجاآوری دین کے معنوں میں آیا ہے۔یہ بھی قریبی مفہوم میں ہے۔اس آیت میں لفظ 'فتنہ' دوسری مرتبہ آیا ہے۔ یہاں فتنہ سے کیا مراد ہے یہ جانے بغیر اس امر کا تعین مشکل ہے کہ لڑائی کب تک جاری رکھنی ہے۔جنھوں نے فتنہ سے مراد شرک لیا ہے اگلے فقرہ میں 'باز آجانے' سے مراد بھی کفر و شرک سے باز آنا لیا ہے اور جنھوں نے اس سے مراد ظلم و جبر لیا ہے اگلے فقرہ میں باز آنے سے مراد لڑائی سے باز آنا لیا ہے۔جوناگڑھیؒ کے ترجمہ میں ہی وضاحت ہے کہ "اگر یہ رک جائیں (تو تم بھی رک جاو)"۔مودودیؒ نے تشریح میں وضاحت کی کہ "باز آجانے سے مراد بھی لڑائی اور مزاحمت کا رویہ چھوڑ دینا ہے"۔چونکہ یہ آیت جہاد کے متعلق ہے تو یہاں یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

پردہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاء الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا۝(الاحزاب:59)

اے نبی! اپنی بیبیوں اور صاحبزادیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے فرمادو کہ اپنی چادروں کا ایک حصّہ اپنے منہ پر ڈالے رہیں یہ اس سے نزدیک تر ہے کہ ان کی پہچان ہو تو ستائی نہ جائیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔(احمد رضاؒ)

اے نبی! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں۔اس سے بہت جلد ان کی شناخت ہو جایا کرے گی پھر نہ ستائی جائیں گی اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔(محمد جوناگڑھیؒ)

اے نبیؐ، اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔(مودودیؒ)

اے نبی، کہہ دے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو نیچے لٹکائیں اپنے اوپر تھوڑی سی چادریں اس میں بہت قریب ہے کہ پہچانی پڑیں تو کوئی ان کو نہ ستائیں۔اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان۔(محمود حسنؒ)

يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ

اس آیت میں يُدْنِينَ کا ترجمہ سب نے ڈالنے اور لٹکانے سے کیا ہے۔ یہ اِدناء سے مشتق ہے جس کے بنیادی معنی لپیٹنے کے ہیں۔ مودودی لکھتے ہیں کہ جب اس پر علیٰ کا صلہ آئے تو اس میں اِرخاء یعنی اوپر سے لٹکانے کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔

احمد رضاؒ نے عَلَيْهِنَّ کے لیے 'منہ پر' کا اضافہ کیا ہے اصل متن میں چہرہ کا ذکر نہیں ہے، البتہ تمام مترجمین نے اس سے مراد چہرہ کا پردہ لیا ہے۔ لیکن ترجمہ میں ہی منہ پر چادر ڈالنے کے الفاظ سے اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ قرآنی الفاظ میں بصراحت چہرہ کا ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت تفسیر میں کرنا بہتر ہے۔

مِن جَلَابِيبِهِنَّ کا مکمل ترجمہ 'چادروں کا ایک حصہ' ہے۔ یہاں مِن تبعیض کے طور پر آیا ہے یعنی کل کا کچھ حصّہ۔ جوناگڑھیؒ نے صرف 'چادروں' سے ترجمہ کیا۔ مودودیؒ نے چادروں کے پلو، محمود حسنؒ نے 'تھوڑی سی چادریں' اور احمد رضاؒ نے 'چادروں کا ایک حصّہ' سے ترجمہ کیا۔ یہاں احمد رضاؒ نے کلی مطابقت کے ساتھ مفہوم کی ترسیل کی ہے۔

ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ

اس مقام پر أَدْنَىٰ کے لئے 'قریب ہے کہ'، 'اس سے نزدیک تر ہے کہ 'لفظی ترجمے ہیں جو بالترتیب احمد رضاؒ اور محمود حسنؒ نے کیے، جونا گڑھی نے 'بہت جلد شناخت ہونے' سے ترجمہ کیا، جبکہ مودودیؒ کا ترجمہ باز بیانیہ کی مثال ہے۔ انھوں نے 'یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے' لکھا۔ یہاں احمد رضاؒ کا ترجمہ اصل متن سے قریب ہے اور روانی کے لحاظ سے بھی بہتر ہے۔

پردہ سے متعلق ایک اور آیت اس طرح ہے۔

قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝ وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (النور: 31)

مسلمان مردوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے بہت ستھرا ہے، بیشک اللہ کو ان کے کاموں کی خبر ہے، اور مسلمان عورتوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی پارسائی کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ نہ دکھائیں مگر جتنا خود ہی ظاہر ہے اور وہ دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں، اور اپنا سنگھار ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ یا شوہروں کے باپ یا اپنے بیٹوں یا شوہروں کے بیٹے یا اپنے بھائی یا اپنے بھتیجے یا اپنے بھانجے یا اپنے دین کی عورتیں یا اپنی کنیزیں جو اپنے ہاتھ کی ملک ہوں یا نوکر بشرطیکہ شہوت والے مرد نہ ہوں یا وہ بچے جنہیں عورتوں کی شرم کی چیزوں کی خبر نہیں اور زمین پر پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ جانا جائے ان کا چھپا ہوا سنگھار اور اللہ کی طرف توبہ کرو اے مسلمانو! سب کے سب اس امید پر کہ تم فلاح پاؤ۔ (احمد رضاؒ)

مسلمان مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت رکھیں۔ یہی ان کے لئے پاکیزگی ہے، لوگ جو کچھ کریں اللہ تعالیٰ سب سے خبردار ہے۔ مسلمان عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت میں فرق نہ آنے دیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو ظاہر ہے اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رہیں، اور اپنی آرائش کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے خاوندوں کے یا اپنے والد کے یا اپنے خسر کے یا اپنے لڑکوں کے یا اپنے خاوند کے لڑکوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنے میل جول کی عورتوں کے یا غلاموں کے یا ایسے نوکر چاکر مردوں کے جو شہوت والے نہ ہوں یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے مطلع نہیں۔ اور اس طرح زور زور سے پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی پوشیدہ زینت معلوم ہو جائے۔ اے مسلمانوں! تم سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم نجات پاؤ۔ (محمد جوناگڑھیؒ)

اے نبیؐ، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ اُن کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اُس سے باخبر رہتا ہے اور اے نبیؐ، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اُس کے جو خود ظاہر ہو جائے، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے مملوک، وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں، اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے اے مومنو، تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ (مودودیؒ)

کہہ دے ایمان والوں کو نیچے رکھیں ذری اپنی آنکھیں اور تھامتے رہیں اپنی ستر کو، اس میں خوب ستھرائی ہے ان کے لئے۔ بیشک اللہ کو خبر ہے جو کچھ کرتے ہیں۔ اور کہہ دے ایمان والیوں کو نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں

اور تھامتے رہیں اپنے ستر کو اور نہ دکھلائیں اپنا سنگھار مگر جو کھلی چیز ہے اس میں سے۔ اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبان پر اور نہ کھولیں اپنا سنگھار مگر اپنے خاوند کے آگے یا اپنے باپ کے یا اپنے خاوند کے باپ کے یا اپنے بیٹے کے یا اپنے خاوند کے بیٹے کے یا اپنے بھائی کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنی عورتوں کے یا اپنے ہاتھ کے مال کے یا کاروبار کرنے والوں کے جو مرد کہ کچھ غرض نہیں رکھتے یا لڑکوں کے جنھوں نے ابھی نہیں پہچانا عورتوں کے بھید کو اور نہ ماریں زمین پر اپنے پاؤں کو کہ جانا جائے جو چھپاتی ہیں اپنے سنگار اور توبہ کرو اللہ کے آگے سب ملکر اے ایمان والو تا کہ تم بھلائی پاؤ۔ (محمود حسنؒ)

يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ کا ترجمہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں، اپنے نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی نظریں بچا کر رکھیں، نیچے رکھیں ذری اپنی آنکھیں سے کیا گیا ہے۔ احمد رضاؒ اور جوناگڑھیؒ نے نگاہیں نیچی رکھنے سے ترجمہ کیا، محمود حسنؒ نے 'آنکھیں' نیچی رکھنے سے ترجمہ کیا۔ یہاں نگاہ یا نظر سے ترجمہ کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مِنْ أَبْصَارِهِمْ کا مکمل فہم ترجمہ میں منتقل کرنے میں مترجمین کو دقت پیش آئی۔ لفظی ترجمہ میں مفہوم واضح نہیں ہے جیسے کہ احمد رضاؒ نے 'نگاہیں کچھ نیچی رکھیں' اور محمود حسنؒ نے 'ذری اپنی آنکھیں' سے اس کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ جوناگڑھیؒ نے صرف 'نگاہیں نیچی رکھیں' سے ترجمہ کیا۔ یہاں دراصل کچھ نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم ہے نہ کہ نگاہیں کچھ نیچی رکھنے کا۔ اس فہم کو ادا کرنے کے لئے مودودیؒ نے مفہوم پر مبنی ترجمہ کیا کیونکہ مکمل فہم لفظی ترجمہ میں ادا کرنا مشکل تھا۔ انھوں نے نظریں بچانے سے ترجمہ کیا اور اپنے مؤقف کی تائید میں لکھتے ہیں کہ ہمیشہ نظریں نیچی رکھنا مطلوب نہیں ہے بلکہ بعض نظریں بچانے کا حکم ہے۔ مِنْ أَبْصَارِهِمْ میں مِنْ تبعیض کے لئے ہے جیسے عورت کو یا دوسروں کے ستر کو دیکھنے سے بچنا۔

مسلمان مردوں اور عورتوں کو حفظِ فروج کا جو حکم دیا گیا اس میں بھی ترجمہ کرتے ہوئے الفاظ کے انتخابات میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ مردوں کے لئے تو شرمگاہوں کی حفاظت سے ترجمہ کیا جبکہ عورتوں کے

لئے 'اپنی پارسائی کی حفاظت'(احمد رضاؒ) اور 'اپنی عصمت میں فرق نہ آنے دیں'(جوناگڑھیؒ) سے ترجمہ کیا گیا۔ مودودیؒ نے مرد و عورت دونوں کے لئے 'شرمگاہوں کی حفاظت' سے ترجمہ کیا جو قرآنی الفاظ سے قریب تر ہے۔ اس مقام پر مودودیؒ نے لفظی مطابقت میں ترجمہ کیا جبکہ جوناگڑھیؒ نے مفہوم پر مبنی ترجمہ کیا۔ محمود حسنؒ نے ستر تھامتے رہنے سے ترجمہ کیا لیکن لفظ حفاظت میں ستر کا چُھپانا اور اور غلط استعمال سے بچنا دونوں مفہوم شامل ہیں۔ لفظ 'تھامنا' میں مفہوم تنگ ہے جو صرف ستر پوشی تک محدود ہے۔ علاوہ ازیں لفظ فُرُوجٌ کے لئے شرمگاہ کے بجائے ستر سے ترجمہ کیا جبکہ اس کے بنیادی معنی 'شرمگاہ' ہی ہیں۔

نِسَائِهِنَّ کا لفظی ترجمہ 'ان کی عورتیں' ہوتا ہے۔ اس کے لئے احمد رضاؒ نے 'اپنے دین کی عورتیں'، جوناگڑھیؒ اور مودودیؒ نے 'اپنے میل جول کی عورتیں'، محمود حسنؒ نے 'اپنی عورتیں' سے ترجمہ کیا۔ اصل متن میں صرف اپنی عورتیں کہا گیا ہے اور اس سے مراد لینے میں مفسرین نے اپنا الگ الگ نقطہ نظر کے مطابق ترجمہ کیا۔ احمد رضاؒ نے ترجمہ میں ہی واضح کر دیا کہ اس سے مراد مسلمان عورتیں ہیں۔ مودودیؒ نے اس سے مراد قریبی تعلق رکھنے والی شریف عورتیں لیا ہے خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ اپنے مؤقف کے دفاع میں مودودیؒ بیان کرتے ہیں کہ اس معاملہ میں اصل چیز جس کا لحاظ کیا جائے گا وہ مذہبی اختلاف نہیں بلکہ اخلاقی حالت ہے۔ شریف، باحیا اور نیک اطوار عورتیں جو معروف اور قابلِ اعتماد خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ہوں، ان سے مسلمان عورتیں بے تکلف ہو سکتی ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن بے حیا، آبرو باختہ اور بد اطوار عورتیں، خواہ 'مسلمان' ہی کیوں نہ ہوں ہر شریف عورت کو ان سے پردہ کرنا چاہئے۔

أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ کا ترجمہ اس طرح آیا:

یا اپنی کنیزیں جو ہاتھ کی ملک ہوں، یا غلاموں کے، اپنے مملوک، یا اپنے ہاتھ کے مال کے۔

اس کے معنی بیان کرنے میں فقہاء میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد مرد غلام ہیں تو بعض کے نزدیک صرف کنیزیں۔ قرآن کے الفاظ کا اطلاق دونوں پر بھی ہوتا ہے۔ اس طرح مودودیؒ کے ترجمہ

میں لفظ 'مملوک' کا اطلاق بھی کنیز اور غلام دونوں پر ہوتا ہے۔ جوناگڑھیؒ نے غلام سے ترجمہ کیا اور اس کی تائید میں حدیث نقل کی ہے کہ مرد غلام سے پردہ کی ضرورت نہیں۔ جنھوں نے اس سے مراد کنیزیں لیں ہیں ان کا خیال ہے کہ نِسَائِهِنَّ میں کنیزیں شامل نہ ہونے کا احتمال (لوگوں کو) ہو سکتا تھا، اس لئے علٰحدہ طور پر کنیزوں کا بھی ذکر کرنا پڑا۔ محمود حسنؒ کا ترجمہ 'مال' سے کیا گیا جو اس محل پر نا قابل فہم ہے۔

أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُوْلِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ کا ترجمہ یا نوکر بشرطیکہ شہوت والے مرد نہ ہوں، یا ایسے نوکر چاکر مردوں کے جو شہوت والے نہ ہوں، وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں یا کاروبار کرنے والوں کے جو مرد کہ کچھ غرض نہیں رکھتے سے کیا گیا ہے۔ إِرْبَة کے معنی خواہش کے ہیں۔ یا ایسی ضرورت کو کہتے ہیں جس کے بغیر چارہ نہ ہو یا اس کے حصول کے لئے تگ و دو کرنی پڑے۔ حاجت یا ضرورت کے لئے بھی بولا جاتا ہے[9]۔ التَّابِعِينَ کا ترجمہ محمود حسنؒ نے 'کاروبار کرنے والے' سے کیا جو غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کاروبار اُردو میں تجارت کے لئے آتا ہے جس کی یہاں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ خادم یا نوکر کو 'تابع' کہتے ہیں۔ مودودی کے نزدیک ایسا نوکر ہے جو زیر دست ہو اور ان کی زیر دستی اس حد تک ہو کہ اسے محکومی کی بنا پر یہ طاقت و جراءت نہ ہو کہ وہ اہل خانہ پر بُری نظر ڈال سکے ۔اسی لئے انھوں نے عام معنی نوکر کو چھوڑ کر 'زیر دست' سے مفہوم پر مبنی ترجمہ کیا۔ لکھتے ہیں: "اس حکم سے بیرے، خانسامے اور دوسرے جوان نوکر مستثنی ہیں، یہ اس تعریف میں نہیں آتے"۔

سود

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لاَ يَقُومُونَ إِلاَّ كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُواْ إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَن جَاءهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىَ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُوْلَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ يَمْحَقُ اللّهُ الْرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللّهُ لاَ يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُواْ الصَّلاَةَ وَآتَوُاْ الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّهَ

وَذَرُواْ مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ فَأْذَنُواْ بِحَرْبٍ مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُوسُ أَمْوَالِكُمْ لاَ تَظْلِمُونَ وَلاَ تُظْلَمُونَ۝ (البقرہ: 275تا279)

وہ جو سود کھاتے ہیں قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر، جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ جسے آسیب نے چھو کر مخبوط بنادیا ہو اس لئے کہ انہوں نے کہا بیع بھی تو سود ہی کے مانند ہے، اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود، تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا تو اسے حلال ہے جو پہلے لے چکا، اور اس کا کام خدا کے سپرد ہے اور جو اب ایسی حرکت کرے گا تو وہ دوزخی ہے وہ اس میں مدتوں رہیں گے۔ اللہ ہلاک کرتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ کو پسند نہیں آتا کوئی ناشکرا بڑا گنہگار، بیشک وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی ان کا نیگان کے رب کے پاس ہے، اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو، نہ کچھ غم، اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود اگر مسلمان ہو پھر اگر ایسا نہ کرو تو یقین کر لو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا اور اگر تم توبہ کرو تو اپنا اصل مال لے لو نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ نہ تمہیں نقصان ہو۔ (احمد رضاؒ)

سود خور لوگ نہ کھڑے ہوں گے مگر اسی طرح جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خبطی بنادے۔ یہ اس لئے کہ یہ کہا کرتے تھے کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام۔ جو شخص اپنے پاس آئی اللہ کی نصیحت سن کر رُک گیا اس کے لئے وہ ہے جو گزرا اور اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے۔ اور جو پھر دوبارہ لوٹا وہ جہنمی ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ ہی اس میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقہ کو بڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے گنہگار سے محبت نہیں کرتا۔ بیشک جو لوگ ایمان کے ساتھ نیک کام کرتے ہیں، نمازوں کو قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب تعالیٰ کے پاس ہے۔ ان پر نہ تو کوئی خوف ہے نہ اداسی و غم۔ اے ایمان والو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ہاں اگر توبہ کرلو تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے،نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔(محمد جوناگڑھیؒ)

مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں،اُن کا حال اُس شخص کا سا ہوتا ہے، جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں اُن کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے''، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خوری سے باز آجائے، تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، سو کھا چکا،اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اِس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے، وہ جہنمی ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بد عمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔ہاں، جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں،اُن کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے،اسے چھوڑ دو،اگر واقعی تم ایمان لائے ہو لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے اب بھی توبہ کرلو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔(مودودیؒ)

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہیں اُٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اُٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس کھو دئے ہوں جن نے لپٹ کر۔یہ حالت ان کی اس واسطے ہے کہ انھوں نے کہا کہ سودا گری بھی ایسی ہی ہے جیسے سود لینا۔حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے سودا گری کو اور حرام کیا ہے سود کو۔پھر جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی طرف سے اور وہ باز آگیا تو اس کے واسطے ہے جو پہلے ہو چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہے۔اور جو کوئی پھر لیوے سود تو وہی لوگ ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔مٹاتا ہے اللہ سود اور بڑھاتا ہے خیرات کو۔اللہ خوش نہیں کسی ناشکرے گناہ گار سے۔جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور دیتے رہے زکوٰۃ ان کے لئے ہے ثواب ان کا ان کے رب کے پاس اور نہ ان کو خوف ہے،نہ وہ

غمگیں ہوں گے۔اے ایمان والو،ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا۔پس اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارے واسطے ہے اصل مال تمہارا۔نہ تم کسی پر ظلم کرو نہ تم پر کوئی۔(محمود حسنؒ)

یہ کیفیت سود خوروں کی قیامت کے روز ہو گی جبکہ وہ قبروں سے اُٹھیں گے۔ان کا یہ حال اس لئے ہو گا کہ وہ دنیا میں کہا کرتے تھے کہ سود بھی تجارت جیسی ہی چیز ہے۔اس آیت کے ترجمہ میں محمود حسنؒ اور احمد رضاؒ 'قیامت کے روز' کا اضافہ کیا۔سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق کرنے والوں کے لئے روزِ آخرت کسی خوف و رنج کا موقع نہیں ہے اور ان آیات میں بتایا گیا کہ سود خور کا حال ایک مجنون و باؤلے شخص کی طرح ہو گا۔یہ دونوں فریقین کے اُخروی حال کا تذکرہ ہے۔اس کے بعد ان کے اس حال کی وجہ ماضی میں بیان کرنا زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔مودودیؒ نے اس کا فقرے کا ترجمہ زمانہء حال میں 'وہ کہتے ہیں' سے کیا۔جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سود خوروں کا مذکورہ حال دُنیا میں ہی اس طرح ہو گا۔علاوہ ازیں تفسیر میں لکھتے ہیں کہ سود خور کی یہ جنونی حالت دُنیا میں بھی ہوتی ہے،اور اس بناپر کہ آدمی جس حالت میں جان دیتا ہے اسی حالت میں قیامت کے روز اُٹھتا ہے۔اسی لئے قیامت کے دن ایک مخبوط الحواس انسان کی صورت میں اُٹھیگا۔گویا انھوں نے سود خوروں کی اس کیفیت کو دُنیا و آخرت کی مشترکہ کیفیت کے طور پر پیش کیا۔لیکن سیاق کے اعتبار سے یہ ترجمہ ماضی کے صیغہ میں کرنا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔باقی تمام مترجمین نے 'انھوں نے کہا' یا 'وہ کہا کرتے تھے' سے ترجمہ کیا۔

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُواْ إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا میں ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ کا لفظی ترجمہ کرنے سے مفہوم واضح نہیں ہوا۔'یہ اس لئے کہ '(جوناگڑھیؒ اور احمد رضاؒ) کے مقابلہ میں 'اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ (مودودیؒ) اور 'یہ حالت ان کی اس واسطے ہے کہ '(محمود حسنؒ) زیادہ وضاحت سے مفہوم کی ترسیل

کررہے ہیں۔احمد رضاؒ نے بَیْعُ کے لئے ترجمہ میں بیع ہی لکھا ،اس کاآسان فہم ترجمہ تجارت و کاروبار ہے،اردو میں بیع وشریٰ کالفظ بھی آتا ہے۔

فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللّهِ کے لئے مختلف تراجم اس طرح کئے گئے:

تواُسے حلال ہے جو پہلے لے چکااور اس کا کام خدا کے سُپرد ہے،اس کے لئے وہ ہے جو گذرااور اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے،جو کچھ پہلے کھا چکا سو کھا چکااس کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے،تواس کے واسطے ہے جو پہلے ہو چکااور معاملہ اس کااللہ کے حوالے ہے۔اس عبارت کالفظی ترجمہ مفہوم کی ترسیل میں کمزور ہے۔اس مقام پراس کے لئے مفہوم پر مبنی ترجمہ زیادہ مناسب ہے۔احمد رضاؒ کے ترجمہ سے اب تک لئے گئے سود کے حلال ہو جانے کا مفہوم نکلتا ہے جس کی قرآن میں صراحت نہیں ہے کہ وہ مال اس کے لئے حلال ہو گیا بلکہ یہ فرمایا گیا کہ اس کا معاملہ اللہ کے ذمہّ ہے اور اللہ جو چاہے اس کے ساتھ معاملہ فرمائے۔ مودودیؒ اس کے بر خلاف لکھتے ہیں کہ یہ ناجائز مال ناجائز ہی رہے گا۔اگر کسی ایماندار آدمی کے پاس وہ مال ہے تو وہ اُسے فلاحِ عامہ میں صرف کرے گااور پاک کرنے کی کوشش کرے گا نہ کہ اسے حلال جان کر اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کرے۔یہ بہر حال ان کی اپنی رائے ہے کیونکہ قرآن میں اس مال کے تعلق سے نہ حلال ہونے کا تذکرہ ہے نہ ہی اسے خیرات کرنے کا ذکر ہے،اصل مطالبہ یہ ہے کہ آئندہ سود سے باز رہے۔پچھلا جو گذر چکااس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔

وَأَمْرُهُ إِلَى اللّهِ میں أَمْرُهُ کا لفظی ترجمہ مفہوم کی بہتر ادائیگی میں مانع ہے۔یہاں مرادی ترجمہ مناسب ہے جیسا کہ باقی مترجمین نے اس سے مراد معاملہ لیا ہے اور یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔علاوہ ازیں مفسرین نے اس کا معاملہ اللہ کی طرف بیان ہونے میں مختلف مفہوم بیان کئے۔احسن البیان میں اس کا مطلب یہ بتایا گیا کہ قبولِ ایمان یا توبہ کے بعد پچھلے سود پر گرفت نہیں ہو گی۔معارف القرآن میں شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ کوئی شخص نے سود کی رقم جمع کی تھی۔سود حرام ہونے کے بعد آئندہ کے لئے توبہ کرلی اور باز آگیا تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہرِ شرع کے حکم سے اسی کی ہو گئی۔اور باطنی معاملہ اس کا اللہ کے

حوالے رہا۔ اگر دل سے توبہ کی تو عنداللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم۔ یہ زیادہ صحیح ہے، یہاں لہ، ملکیت کے معنوں میں ہے۔

اگرچہ محمود حسنؒ کا ترجمہ لفظی ہے لیکن إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ کے ترجمہ (اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا) میں انھوں نے ترجمانی کا طرز اختیار کیا۔ ان کے ترجمہ سے یہ مفہوم نکل رہا ہے کہ اگر تمہیں یقین ہے کہ یہ حکم اللہ کا ہے تو پھر اللہ کے ڈر سے سود لینا چھوڑ دو۔

وَاللّهُ لاَ يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ کا ترجمہ اللہ کو پسند نہیں آتا کوئی ناشکرا بڑا گنہگار، اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے گنہگار سے محبت نہیں کرتا، اور اللہ کسی ناشکرے بد عمل انسان کو پسند نہیں کرتا، اللہ خوش نہیں کسی ناشکرے گنہگار سے کیا گیا۔ کسی ناشکرے یا گنہگار کے لئے اللہ تعالیٰ کا خوش نہ ہونا یا محض محبت نہ کرنے کے مقابلہ میں ناپسندیدگی کے معنوں میں ترجمہ کرنے میں زیادہ تاکید ہے۔

لاَ تَظْلِمُونَ وَلاَ تُظْلَمُونَ کے ترجمہ میں احمد رضاؒ نے ظلم کا ترجمہ نقصان سے کیا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہاں سود کے مال کے ضمن میں ظلم استعمال ہوا ہے۔ اس لئے انھوں نے مالی نقصان کے حوالہ سے ترجمہ کیا۔ لیکن ظلم کا اُردو مترادف بھی ظلم ہی ہے جو جامع بھی ہے اور لفظ نقصان، ظلم کے مقابلہ میں ہلکا ہے۔ باقی مترجمین نے ظلم کی اصطلاح ہی ترجمہ میں برتی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ نقصان کوئی معمولی نقصان نہیں جو تم لوگوں کے ساتھ کر رہے ہو بلکہ یہ ظلم کے مترادف ہے۔ اگر سود لینے والا زائد رقم اصول کرے تو یہ اس کی طرف سے ظلم ہے اور اگر قرضدار اصل رقم بھی واپس نہ کرے تو یہ اس کی طرف سے ظلم ہے۔ یہاں دونوں کی ممانعت آئی ہے۔

حوالہ جات

[1] مولانا عمر احمد عثمانی، فقہ القرآن، تاج کمپنی (دہلی)، 2011ء، ص153

[2] ڈاکٹر محی الدین غازی، اردو تراجم قرآن پر ایک نظر، مشمولہ ماہنامہ الشریعہ، شمارہ نمبر 11، نومبر 2014ء

[3] مولانا عمر احمد عثمانی، فقہ القرآن، تاج کمپنی (دہلی)، 2011ء، ص154

[4] سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (دہلی)، 2011ء، جلد دوم، ص634

[5] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء

[6] مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، فیروز سنس (لاہور)

[7] المائدہ:3

[8] سورۃ النصر

[9] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء

اختتامیہ

اوراق گذشتہ میں قرآن کے چار اردو تراجم کا موضوعاتی تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا۔اس مطالعہ سے جو نتائج اخذ ہوئے وہ اس طرح ہیں۔

ہر قرآنی موضوع کا طرزِ بیان مختلف اور منفرد ہے۔یہ قرآن کی لسانی خوبی ہے کہ طرزِ بیان اور مضمون و معانی میں مکمل تناسب پایا جاتا ہے۔یعنی تمثیلات کا طرزِ بیان احکامات والی آیات سے مختلف ہوتا ہے اور مناظر و تصویر کشی کا حُسن جو آخرت کے بیان میں ہے وہ علمی موضوعات کے وضاحتی اسلوب سے منفرد ہوتا ہے۔عموماً ترجمہ کرتے وقت مترجم ایک ہی اسلوب اختیار کرتا ہے جو اس کا اپنا اسلوب یا تحریر ہوتا ہے۔اگر ترجمہ لفظی ہو تو قرآن کے تمام اسالیبِ بیان متاثر ہوتے ہیں۔میں نے اپنے تحقیقی جائزے میں جو باتیں موضوعات سے متعلق محسوس کی ہیں وہ اس طرح ہیں۔

تمثیلات کے لئے لفظی ترجمہ غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔بلکہ تمثیلات کا لفظی ترجمہ ممکن ہی نہیں۔اس میں مفہوم کی وضاحت کے ساتھ کلام کی تاثیر بھی متاثر ہوتی ہے اور فہم کی پیچیدگی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔مثال کے طور پر درج ذیل ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر: 29)

اللہ نے بتلائی ایک مثل ایک مرد ہے کہ اس میں شریک ہیں کئی ضدّی اور ایک مرد ہے پورا ایک شخص کا کیا برابر ہوتی ہیں دونوں مثل سب خوبی اللہ کے لئے ہے پر وہ بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔(محمود حسنؒ)

تمثیلات کے بیان میں ترجمانی کا انداز مؤثر ہوتا ہے۔کیونکہ تمثیلات میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ تمثیل مخاطب کو متاثر کرنے کے ساتھ مدّعا کو اس پر پوری طرح واضح کردے۔دراصل

یہ غیر محسوس چیزوں کو محسوس حقائق کے ذریعہ حسی بنا دیتی ہے۔ یہ تاثیر ترجمہ میں بھی آنی چاہئے۔ ظاہر ہے یہ چیز لفظی ترجمہ میں نہیں سما سکتی۔

تمثیلات کے جائزے میں میں نے تمثیل کے اجزاء کو بھی واضح کیا ہے یعنی ہر تمثیل میں ممثل لہ،، وجہ تمثیل اور مثال کی نشاندہی کی ہے۔

قرآن کے علمی موضوعات کا ترجمہ کرتے وقت الفاظ واصطلاحات کا ترجمہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس موضوع کے تحت 'ترجمانی' کے بجائے 'ترجمہ' ہی حقائق سے قریبی مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس لئے کہ طرزِ ترجمانی میں جہاں مفہوم کو واضح کرنے کی گنجائش ہوتی ہے وہیں اصل متن کی کچھ باریکیاں چھوٹ جاتی ہیں۔ اور اصل متن میں جملہ کی ترکیب کا اعجاز ترجمہ کے متن میں واضح نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ ضمیر کا مرجع واضح کرنا بھی اہم ہے۔ الفاظ واصطلاحات کے متعدد مترادفات سے قریبی مفہوم واضح کرنے والے لفظ کا انتخاب اہمیت کا حامل ہے۔ جیسے لفظ اَنبَتَ کے معنی جو کچھ زمین اگائے ہے۔ اس کے لئے پیداوار کی مخصوص قسم سبزی یا سبزے کے مقابلہ میں 'زمین کی پیداوار' سے ترجمہ کرنا بہتر ہے۔

اسی طرح أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىٰ میں لفظ أَزْوَاجًا اور شَتَّىٰ قریبی معنوں میں ہیں، یہاں ایک ہی مفہوم دونوں کا مراد لینے کے مقابلہ میں وسیع معنی پیدا کرنا لائقِ ترجیح ہے۔ جیسے أَزْوَاجًا۔ جوڑا، شَتَّىٰ۔ مختلف قسم، متفرق جدا جدا ہونا۔

سائنسی حقائق کے پہلو سے تقابلی مطالعہ کے دوران یہ بات سامنے آئی ہے کہ قرآن کا ترجمہ و تفسیر کوئی ایک عالم سے یا کسی ایک دور میں ممکن نہیں جیسے جیسے علمی ترقیات کے حوالے سے جدید انکشافات سامنے آئیں گے ان کے مطابق آیاتِ الٰہی کے عظیم معانی اور وجوہ اعجاز ہم پر آشکارا ہوتے جائیں گے۔

آخرت کا بیان ایک ایسا موضوع ہے جس میں تصاویرِ قرآنی بہت متحرک اور کلام کی تاثیر اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں بیان کردہ حقائق ایسے ہیں جس سے عقلِ انسانی کا عجز ظاہر ہوتا ہے۔ ان موضوعات کا ترجمہ کرتے وقت وہ مناظر ترجمہ میں منتقل ہونے چاہئیں جو قرآن کے اصل زبان کی تلاوت کے دوران

قاری کے ذہن پر اپنا عکس چھوڑتے ہیں۔ جنت اور جہنم کا منظر و قیامت کے مناظر و احوال ایسے پیرایہ میں بیان ہوں جو خوشی و مسرت اور غم و پریشانی کے جذبات میں حرکت پیدا کرے۔ اس کے لئے ترجمانی کا طرز موزوں ہوتا ہے۔ قرآنی تصاویر یہاں بہت زیادہ متحرک محسوس ہوتی ہیں۔ اگر ان آیات کا ترجمہ بھی لفظی ہو تو اپنا حُسن کھو دیتا ہے۔

دوسری خصوصیت جو عربی متن میں ہے وہ آیتوں میں خاص وزن اور آہنگ ہے جو تاثیرِ کلام کو بڑھا دیتا ہے۔ اس کا نثری ترجمہ میں انتقال بہرِ حال ایک امرِ محال ہے۔

اس کے علاوہ قرآنی تراجم کے موضوعاتی تقابلی مطالعہ سے جو عمومی نتائج ظاہر ہوئے وہ اس طرح ہیں۔

1۔ ہر مترجم اپنے اسلوب و اندازِ بیان میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

مولانا احمد رضا خانؒ کے ترجمہ کو نہ لفظی ترجمہ کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی مفہوم پر مبنی بلکہ یہ ملی جُلی کیفیت ان کے ترجمہ میں ظاہر ہوئی۔ بسا اوقات جملوں کی ترکیب روانی و سلاست کے ساتھ ہے تو کبھی جملے مکسر (ٹوٹے ہوئے) اور اردو نحو کے اعتبار سے جملہ کی تقدیم و تاخیر متاثر ہوتی نظر آتی ہے۔ کبھی ترجمہ مفہوم پر مبنی نظر آتا ہے تو چند آیات کا ترجمہ لفظی معلوم ہوتا ہے۔

مولانا محمد جوناگڑھیؒ کا ترجمہ جامعیت کے پہلو سے بہتر ترجمہ ہے۔ ترجمہ میں مطابقت کے پہلو سے یہ اصل متن سے قریبی مطابقت رکھنے والا ترجمہ ہے۔ ان کا طرزِ ترجمہ مفہوم پر مبنی ہے لیکن اصل متن کے الفاظ کو ہی ترجمہ میں ہدفی زبان کے اسلوبِ بیان کا لحاظ کرتے ہوئے برتا گیا ہے۔ جو الفاظ اصل متن میں نہیں ہیں انھیں قوسین میں لکھا گیا ہے۔ یہ محتاط ترجمہ ہے جس میں مفہوم کی ترسیل کم سے کم الفاظ میں کی گئی۔ اس طرح اصل متن سے مطابقت کی کوشش کی گئی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ترجمہ بھی مفہوم پر مبنی ہے البتہ اس میں اصل متن کے الفاظ کے من و عن ترجمہ کی پابندی نہیں کی گئی۔ یہ ترجمانی کے طرز پر کیا گیا ہے۔ مفہوم کی منتقلی اردو محاورے و

اسالیبِ بیان کے مطابق کی گئی ہے۔اس طرزِ ترجمہ میں مفہوم کی منتقلی کے ساتھ تاثیرِ کلام اور زورِ بیان اور بلاغتِ اسلوب بھی ترجمہ میں در آیا ہے۔یہ ترجمہ نہایت سلیس اور بامحاورہ ترجمہ ہے۔

مولانا محمود حسنؒ کا ترجمہ بیشتر لفظی ہے لیکن مکمل طور پر لفظی ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہیں کہیں اردو محاورہ کے اعتبار سے ترجمہ کیا گیا ہے۔بعض مقامات پر لفظی ترجمہ سے ہٹ کر مرادی ترجمہ بھی کرتے نظر آتے ہیں۔جملوں کی ترکیب اردو کی نحوی ترکیب سے مختلف ہے۔

2۔کوئی بھی مترجم اپنے ترجمہ میں ہر مقام پر یکساں معیار برقرار نہیں رکھ سکتے۔ایک مقام پر کسی نے بہت ہی جامع الفاظ استعمال کئے تو دوسرے مقام پر وہی مترجم اس معیار کا لفظ ترجمے میں برتنے میں چوک گئے۔اس طرح کسی بھی مترجم کو دوسرے پر فوقیت دینا مناسب نہیں البتہ کسی خاص پہلو سے وہ دوسروں کے مقابلہ میں نمایاں ضرور ہوتے ہیں۔ جیسے مفہوم کی ترسیل میں کوئی زیادہ مؤثر ہے تو کوئی مطابقت کے پہلو سے نمایاں ہیں۔

ہر مترجم کا ترجمہ ایک زاویہ سے مستحسن ہے تو دوسرے زاویہ سے اصل کے مقابلہ میں کچھ کمی رہ جاتی ہے۔مثال کے طور پر مودودیؒ کے طرز ترجمانی میں تاثیر کلام ،انداز بیان کی شدت کے ساتھ طنز و استفہام بھی ترجمہ میں در آتا ہے تشبیہات واستعارات کا ترجمہ خوبی سے انجام پاتا ہے لیکن ساتھ ہی اصل زبان کے کچھ اعجازی پہلو چھوٹ جاتے ہیں اصل متن کی کچھ باریکیاں جیسے عربی زبان کے جملوں کی ترکیب کا اعجاز اور اسلوب کی جامعیت متاثر ہوئی،اور یہ طرز اصل متن اور ترجمہ میں مطابقت کے پہلو سے کمزور ہوتا ہے۔

اسی طرح جوناگڑھیؒ کا ترجمہ جامعیت کے پہلو سے بہترین ہے تو تشبیہ واستعارات کا حسن اور کلام کی تاثیر میں کمی محسوس ہوتی ہے لفظی ترجمہ میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ ترجمہ اصل متن کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور لفظی مطابقت بھی پائی جاتی ہے لیکن مفہوم کی وضاحت نہیں ہوتی۔عبارت گنجلک اور قاری دوست نہیں ہوتی۔اردو کی نحوی ترکیب بھی متاثر ہوتی ہے۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہر مترجم قرآنی مفاہیم کے تمام پہلوؤں کو ترجمے میں سمیٹنے سے قاصر ہے۔ ہر کوئی قرآنی مفاہیم کو اپنے فکری رجحان اور علمی استعداور ذوق فہم اور تجربات کے مطابق ترجمہ میں برتتا ہے۔ کوئی بھی ترجمہ مکمل اور حرف آخر نہیں ہو سکتا۔ نئے تراجم کی مسلسل کوشش ہونی چاہئے۔ جواُن پہلوؤں کو اپنی آغوش میں لے لیں جو آج تک انسانی نظروں سے اوجھل رہی ہیں۔

3۔ بعض قرآنی الفاظ واصطلاحات کے ترجمہ میں مترجمین ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں میں نے مندرجہ ذیل پہلوؤں سے الفاظ واصطلاحات کا جائزہ لیا:

الف۔ قرآن کے ایک لفظ کے مقابلہ میں ترجمہ میں کونسا لفظ زیادہ مفہوم سمیٹے ہوئے ہے۔

ب۔ مفہوم کی منتقلی میں سیاق کے اعتبار سے کونسا لفظ زیادہ مؤثر ہے۔

مثلاً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ میں أَوْدِيَةٌ کا ترجمہ 'ندی نالہ' اور 'نالے' سے کیا گیا۔ اگر 'دریا' سے ترجمہ کیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ کیونکہ نالہ تنگ مفہوم پیش کر رہا ہے اور نالہ سے جھاگ اٹھنے کا تصور کرنا بھی مشکل ہے، جس کی یہاں مثال پیش کی جارہی ہے۔ کیونکہ قصبوں میں جو ایک آدھ کلو میٹر کے اندر پانی بہتا ہے وہ بھی نالہ ہے جس میں نہ موج ہوتی ہے نہ سیلِ رواں۔ جبکہ وادی کا جو تصوّر ہے وہ بہت وسیع ہے، جیسے دریائے گنگا، دریائے نیل وغیرہ جس میں بہاؤ کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ درختوں کو بھی بہالے جائے اور اس کے نتیجہ میں بلند جھاگ اٹھتے ہیں لیکن کچھ ہی دیر میں فنا ہو جاتے ہیں۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّهِ میں وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّهِ کا ترجمہ اور ایک اللہ کی پوجا ہو، اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ آجائے، اور دین اللہ کے لیے ہو جائے، اور حکم رہے خدا تعالیٰ کا سے کیا گیا۔ اس آیت کے ترجمہ میں مطابقت کے حوالہ سے مودودیؒ نے کُلی مطابقت سے ترجمہ کیا جبکہ جوناگڑھیؒ نے مفہوم پر مبنی ترجمہ کیا۔ جوناگڑھیؒ کے ترجمہ سے دین کے غلبہ تک لڑائی جاری رکھنے کا مفہوم نکلتا ہے جبکہ احمد رضاؒ کے ترجمہ میں دین کا مطلب پوجا تک محدود ہے۔ مودودیؒ نے 'دین اللہ کے لئے ہو جانے' سے

مراد ایسی حالت کا قیام لیا ہے جہاں بندے قانونِ الٰہی کے مطیع بن کر رہیں یعنی نظامِ حق کا قیام مراد ہے۔اس طرح یہ بھی دین کے غلبہ کے مترادف ہے۔ محمود حسنؒ کے ترجمہ سے اللہ کے احکامات کی بجاآوری دین کے معنوں میں آیا ہے۔دین کے مقابلے میں پوجا، دین اور حکم یہ تینوں الفاظ آئے ہیں۔ اس میں لفظ 'پوجا' کا اطلاق نجی عبادت پر ہوتا ہے۔ حکم کے لئے عربی میں حَکَمَ آتا ہے۔ یہاں لفظ 'دین'، پوجا یا حکم کے مقابلہ میں زیادہ وسیع معنوں میں ہے۔

اسی طرح حِلْیَۃٌ کے لئے زیور اور گہنا سے ترجمہ کیا گیا۔اس مقام پر زیور وسیع معنوں میں ہے جبکہ گہنا، زیور کے ایک خاص قسم کی ترجمانی کرتا ہے۔

کبھی کبھی کسی لفظ کے معنی لغت میں کچھ اور ہوتے ہیں لیکن جس سیاق میں برتا جاتا ہے اور جملہ کی ترتیب میں جس منصب پر ہوتا ہے وہ اسے کچھ اور معنی عطا کرتے ہیں۔ ترجمہ کے دوران اس لفظ کے بنیادی معنوں سے ہٹ کر سیاق وسباق کے معنوں تک پہنچنا مترجم کی ذمہ داری ہوتی ہے۔اس لحاظ سے بھی ترجمہ میں اختلاف ہوتا ہے۔ جیسے لاَ یَخْرُجُ إِلاَّ نَکِدًا کا ترجمہ اس میں نہیں نکلتا مگر تھوڑا بمشکل، اس کی پیداوار بہت کم نکلتی ہے، اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا، اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص سے کیا گیا ہے۔

نَکَدَ کے معنی محروم کر دینا یا تھوڑا سا دینا ہے۔نَکَدَ سے مراد وہ تنگی ہے جو خیر (خوشحالی) لانے سے مانع اور رکاوٹ ہو۔ یہاں پر 'کم پیداوار' کے مقابلہ میں 'ناقص پیداوار' مفہوم سے قریب تر ہے۔ کیونکہ کم پیداوار کچھ تو فائدہ دیتی ہے لیکن ناقص پیداوار میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔اس کو سمجھنے کے لئے تفسیر کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تمثیل کے پیرایہ میں قلبِ مومن و قلبِ کافر کی مثال دی جارہی ہے۔اس پر سب کا اتفاق ہے۔اس طرح اگر 'تھوڑی پیداوار' معنوں میں استعمال کریں تو اس سے مراد کافر کے دل پر بھی تھوڑا ایمانی اثر ہونے کا اشارہ ملتا ہے جبکہ ناقص پیداوار سے مراد ان کے دلوں میں جو کھوٹ اور غیض وغضب ہے اس کے ظاہر ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔

مومن کا قلب زرخیز زمین کی طرح ہے جو قرآن کی تعلیمات کو قبول کر کے حُسنِ اخلاق و حُسنِ اعمال کی مثال بن جاتا ہے۔ جبکہ کافر کا دل ان آیات کو قبول تو نہیں کرتا، بلکہ قرآن سُن کر مزید مشتعل ہو جاتا ہے اور اپنے دل کا غیض و غضب نکالتا ہے۔ اس کے لئے ناقص پیداوار اور خاردار جھاڑیاں ہی زیب دیتی ہے جو انسان کو کچھ نفع تو نہیں دے سکتی البتہ نقصان ضرور پہنچا سکتی ہے۔

اسی طرح اخْتَلَطَ کے اصل معنی ملنا ہے۔ لیکن سورہ کہف آیت 45 میں فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ کے مفہوم میں گھنا سبزہ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

4۔ ترجمہ پر مترجم کے سماجی پس منظر، علمی قابلیت، فکر اور رجحان کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ کے لیے کسی کنڈے کے دریا، گہرے دریا، اور سمندر کے الفاظ ترجمہ میں آئے ہیں۔ دراصل شمالی ہند میں سمندر کو دریا بھی کہتے ہیں اس لحاظ سے مودودیؒ کے سواسب نے 'دریا' سے ترجمہ کیا جو ان کے محاورہ کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ اس کو ترجمہ پر علاقائی اثر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن سمندر میں دریا کے مقابلہ میں وسعت پائی جاتی ہے۔ سمندر، دریا سے اس طرح مختلف ہے کہ ایک سمندر میں کئی دریا ملتے ہیں۔ یہاں مودودیؒ نے بحر کا سمندر سے ترجمہ کیا۔

اسی طرح آیت وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيراً وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ کا ترجمہ مولانا محمود حسنؒ نے اس طرح کیا:

"اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے تو ڈھائے جاتے تکئے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت۔ اور اللہ مقرر مدد کرے گا اس کی جو مدد کرے گا اس کی۔ بیشک اللہ زبردست ہے زور والا"۔

بِيَعٌ کے معنی عیسائیوں کی عبادت گاہیں جسے اُردو میں 'گرجا' کہتے ہیں۔ اس لفظ کے لئے جونا گڑھیؒ نے 'گرجے اور مسجدیں' سے ترجمہ کیا جبکہ محمود حسنؒ نے اس لفظ کے لئے 'مدرسے' کا استعمال کیا۔ اردو طبقہ

میں مدرسہ کا ایک الگ مفہوم ہے۔ یہاں پر 'مدرسہ' سے ترجمہ کرنے میں اسے عبادت گاہ کا درجہ حاصل ہو گیا۔اسے ہم مترجم کی فکر کا ترجمہ پر اثر کہہ سکتے ہیں۔ محمود حسنؒ کے ترجمہ کی ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کی اختیار کی گئی تمام اصطلاحات میں کہیں بھی یہودی یا عیسائی عبادت گاہوں کا مفہوم نہیں نکلتا۔

5۔ ترجمہ میں کتنا ہی محتاط رویہ اختیار کیا جائے، مداخلت ہوتی ہی ہے۔ بعض اوقات ترجمہ میں مفہوم کی بہتر اور مکمل ترسیل کے لئے مداخلت ضروری ہو جاتی ہے جسے مداخلتِ مطلوب کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اس کے اسالیبِ بیان میں ایجاز (حذف) کا اسلوب مترجم سے تقاضہ کرتا ہے کہ وہ ترجمہ میں محذوف کو واضح کرے۔ تقابلی مطالعہ کے دوران اس کی چند مثالیں سامنے آئیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

مراحلِ قیامت میں سورہ الحاقہ کی آیت 17 میں لفظ ثَمَانِيَةٌ آیا ہے جس میں 'فرشتوں' کے معنی محذوف ہے۔ جس کے لئے لفظ 'فرشتے' کا اضافہ مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ جبکہ یہی فقرہ محمود حسنؒ کے ترجمہ میں مداخلتِ بے جا کی ایک مثال ہے۔ انھوں نے لفظ ثَمَانِيَةٌ کے لئے 'آٹھ شخص' سے ترجمہ کیا۔ 'شخص' کا لفظ اردو میں انسانوں یا افراد کے لئے بولا جاتا ہے فرشتوں کے لئے نہیں۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ میں اللہ کے سامنے پیش کئے جانے کا مفہوم چُھپا ہوا ہے۔ یہ عربی میں اسلوبِ حذف کے تحت آتا ہے جسے اہلِ زبان بخوبی سمجھتے ہیں۔ لیکن ترجمہ کرتے وقت حذف کو کھولنے سے ہی مفہوم مبرہن ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر 'رب کے سامنے' کا اضافہ کرنے سے ترجمہ میں مکمل فہم پیدا ہوتا ہے جسے ہم ترجمہ میں 'مطلوب مداخلت' کہہ سکتے ہیں۔

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ میں مَن يَنصُرُهُ کا احمد رضاؒ نے تفسیری ترجمہ کیا۔ 'جو مدد کرے گا اس کی' کے بجائے 'جو اللہ کے دین کی مدد کرے گا' سے کیا۔ مودودیؒ نے 'اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے'، جوناگڑھیؒ نے 'جو اللہ کی مدد کرے' سے کیا۔ اللہ کی مدد کرنے سے کیا مراد ہے یہ تشریح طلب بات ہے جسے تفسیر معارف القرآن اور تفہیم القرآن میں اللہ کے دین کی مدد کے معنوں میں سمجھایا گیا۔ اس طرح احمد رضاؒ نے ترجمہ میں ہی مراد کو واضح کیا، البتہ 'دین کی مدد' قوسین میں لکھتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

بسااوقات ایسے الفاظ مترجم کی جانب سے ترجمہ میں در آتے ہیں جن کی اس مقام پر کوئی ضرورت یا گنجائش نہیں ہوتی۔ جسے ہم ترجمہ کی اصطلاح میں مداخلتِ بے جا کہتے ہیں۔اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مولانا احمد رضاؒ نے سورۃ الدھر، آیت 15 عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا کے لئے 'وہ ادرک کیا ہے، جنت میں ایک نہر ہے جسے سلسبیل کہتے ہیں' سے کیا۔اس ترجمہ میں چشمہ گویا ادرک کا ہے۔اس جملے میں 'وہ ادرک کیا ہے' کے فقرے کے اضافہ سے مفہوم کو مبہم کر دیا جس سے یہ تصوّر قائم ہوتا ہے کہ وہ چشمہ ادرک کا ہے جبکہ صاف اشارہ اس شراب کی طرف ہے جس میں سونٹھ ملائی جائے گی۔

سورۃ الدّھر، آیت 21 میں شَرَابًا طَهُورًا صفت موصوف کے طور پر آیا ہے لیکن محمود حسنؒ نے 'شراب جو پاک کرے دل کو' سے ترجمہ کیا۔ یہاں جنّت کی شراب کی پاکیزگی بتائی گئی ہے جس سے انسان اس دنیا میں واقف نہیں ہے۔ جو نہ مزہ میں مکدر ہے نہ ہی عقلوں کو زائل کرتی ہے۔

سورہ نور آیت 39 میں وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَاب کا ترجمہ علی الترتیب اس طرح ہے:

اور اللہ جلد حساب کر لیتا ہے، اللہ بہت جلد حساب کر دینے والا ہے، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی، اور اللہ جلد لینے والا ہے اس کا حساب۔

محمود حسنؒ کے ترجمہ میں لفظ 'اس کا' زائد ہے کیونکہ یہاں کسی خاص شخص کے حساب لینے کا ذکر نہیں بلکہ یہ جملہ اللہ کی صفتِ دائمہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

سورہ احزاب، آیت 59 میں يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ کے ترجمہ میں احمد رضاؒ نے عَلَيْهِنَّ کے لیے 'منہ پر' کا اضافہ کیا ہے اصل متن میں چہرہ کا ذکر نہیں ہے، البتہ تمام مترجمین نے اس سے مراد چہرہ کا پردہ لیا ہے۔ لیکن ترجمہ میں ہی منہ پر چادر ڈالنے کے الفاظ سے اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ قرآنی الفاظ میں بصراحت چہرہ کا ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت تفسیر میں کرنا بہتر ہے۔

6۔قرآنی مفاہیم کو ترجمہ میں سمیٹنے کے لئے لفظی ترجمہ ناممکن ہے۔جائزہ میں ایسا متعدد مرتبہ محسوس ہوا کہ لفظی ترجمہ کی وجہ سے یاتو مفہوم گنجلک ہوا یا مفہوم کو واضح کرنے کے لئے مترجم کو لفظی ترجمہ چھوڑ کر مرادی ترجمہ کرنا پڑا۔

محمود حسنؒ نے لفظی ترجمہ کا طرز اختیار کیا اس کے باوجود ان کے ترجمہ میں بارہا ایسے مواقع سامنے آئے جہاں لفظی ترجمہ سے کبھی کبھی مفہوم مبہم ہو گیا تو کبھی انھوں نے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے لفظی ترجمہ چھوڑ کر مرادی ترجمہ کیا۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

الف۔لفظی ترجمہ مفہوم کی صحیح ترسیل میں مانع

سورہ حٰم السجدہ، آیت 11 میں ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ کا ترجمہ "پھر چڑھا آسمان کو"۔

سورۃ الذّاریات، آیت 47، وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ میں أَيْدٍ کا ترجمہ 'ہاتھ' سے۔

سورہ حٰم السجدہ، آیت 10 میں سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ کا ترجمہ "پورا ہوا پوچھنے والوں کو"

ب۔مفہوم کی بہتر وضاحت کے لئے مرادی ترجمہ کی مثالیں۔

سورۃ الاعراف، آیت 58 کے فقرہ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ میں لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ کا ترجمہ ان کے لیے جو احسان مانیں، ان لوگوں کے لیے جو قدر کرتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو شکر گزار ہونے والے ہیں اور حق ماننے والے لوگوں کو سے کیا گیا ہے۔

محمود حسنؒ کا طرزِ ترجمہ اگرچہ لفظی ہے لیکن کبھی کبھی انھوں نے لفظی ترجمہ سے ہٹ کر سیاق کی مناسبت سے مرادی ترجمہ بھی کیا ہے، جیسے یہاں پر لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ کا ترجمہ 'حق ماننے والوں' سے کیا۔

اس مقام پر اگر آیت میں بیان ہونے والے انعامات جیسے (بارش و پیداوار) پر غور کریں تو شکر کرنے والے یا، قدر کرنے والوں' سے ترجمہ کرنا زیادہ موزوں ہے۔اور اگر اس تمثیل میں قلبِ مومن و قلبِ کافر کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس زاویہ سے دیکھیں تو 'حق ماننے والے' بہتر ترجمانی کر رہا ہے۔

7۔ تقابلی مطالعہ میں ایک نکتہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ قرآن کی جامعیت کو ترجمہ میں برتنا ناممکن ہے۔

قرآنی الفاظ میں ایک لفظ، ذو معنی، سہ معنی اور کبھی متعدد معانی اپنے اندر رکھتا ہے اور ہر مطلب چسپاں ہوتا ہے۔ اب یہ مترجم کی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کونسے معنی اختیار کرتا ہے، یہ پوری طرح مترجم کی علمیت کے ساتھ ساتھ قابلیت، ذکاء اور عربی محاوروں سے واقفیت اور تجربہ وغیرہ پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک آیت کے کئی معنی سامنے آتے ہیں۔ اس طرح تقابلی مطالعہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قرآنی آیات کے متعدد معانی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مثال کے طور پر سورۃ الذّاریات، آیت 47 میں وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ کا ترجمہ، بے شک ہم کشادگی کرنے والے ہیں، اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں، ہم وسعت دینے والے ہیں کے علاوہ بے شک ہم توسیع کر رہے ہیں بھی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح، علقہ کے معنی خون، جونک، لٹکنے والی چیز اور چمٹنے والی چیز کے ہیں۔ اور جدید ترقیات اور طاقتور خوردبینوں کے ذریعہ جنین کے مرحلہ وار تخلیقی مراحل میں یہ تمام معنی منطبق ہوتے ہیں۔ وہ پہلے خون بستہ کی شکل میں پھر جونک کی طرح مادر رحم سے چمٹ کر لٹکتا ہے۔ اس کے بعد وہ مضغہ یعنی گوشت کی بوٹی جو منہ میں چبائے ہوئے بقیہ کے مماثل ہوتی ہے، کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس طرح تمام معنوں کو سمیٹ کر ایک لفظ میں ترجمہ کرنا ناممکن ہے۔

8۔ ترجمہ میں ضمیر کا مرجع متعین کرنے میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اور ضمیر کا مرجع متعین کرنے میں بھی مترجمیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر سورۃ الاعراف، آیت 57 کے فقرہ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءفَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ کے تراجم کچھ اس طرح آئے: پھر اس سے پانی اتارا پھر اس سے طرح طرح کے پھل نکالے، پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں، اور وہاں مینہ برسا کر (اسی مری ہوئی زمین

سے)طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے، پھر اتارتے ہیں اس بادل سے پانی پھر اس سے نکالتے ہیں سب طرح کے پھل۔

فَأَخْرَجْنَا بِهِ میں 'ہ' کی ضمیر پانی کی طرف ہے۔ مولانا مودودیؒ کے ترجمہ میں ایسا لگ رہا ہے جیسے 'ہ' کی ضمیر کا مرجع زمین ہے۔ جبکہ زمین عربی میں مؤنث استعمال ہوتی ہے۔اور اگر زمین کی طرف اشارہ کرنا ہوتا تو فَأَخْرَجْنَا بِهَا ہوتا۔اگرچہ مودودیؒ کا طرز ترجمہ ترجمانی ہے لیکن جہاں پانی کی طرف اشارہ ہو وہاں زمین تو نہیں کہنا چاہیے اگر مولانا قوسین میں (اسی مردہ زمین سے) کا اضافہ نہ کرتے تو اس بات کا احتمال نہ ہوتا۔ اس جگہ محمد جوناگڑھیؒ کا ترجمہ واضح بھی ہے اور جامع بھی۔ جس میں ضمیر کے مرجع (بادل اور پانی) کا ذکر کرنے سے مفہوم میں وضاحت آگئی۔

اسی طرح سورۃ القیامہ کی آیت 39، فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى کا ترجمہ مولانا محمود حسنؒ نے یوں کیا: 'پھر کیا اس میں جوڑا نر اور مادّہ'۔ یہاں مِنْهُ کا ترجمہ 'اس میں' سے کیا گیا۔اس ترجمہ سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ 'ہ' کی ضمیر فَخَلَقَ فَسَوَّى کی طرف ہے یعنی انسان کے بننے اور ٹھیک ہونے کے بعد اس کی جنس بنائے جانے کے معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ قواعد کی رو سے بھی مِنْهُ کا ترجمہ 'اس سے' ہی ہونا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا نکات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید کا پوری صحت کے ساتھ مکمل اور جامع ترجمہ کرنا کسی ایک عالم کی کوشش سے یا کسی ایک صدی میں ممکن نہیں ہے۔ جیسے جیسے علمی ترقیات ہوتی جائیں گی قرآن کے نئے مفاہیم سامنے آتے رہیں گے۔ لہٰذا، قرآن کے ترجمہ میں اجتماعی کاوش کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف ماہرینِ علوم اور علمائے شریعت و ادب کی باہمی مشاورت اور تعاون کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ قرآنی مفاہیم کو ترجمہ میں سمیٹا جا سکتا ہے۔اس کے لئے علمائے زبان و ادب، علمائے شریعت اور ماہرینِ علومِ عصریہ کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے تاکہ قرآنی آیات کے تمام ممکنہ مفاہیم ترجمہ میں سمیٹے جا سکیں۔

کتابیات

تفاسیر

1۔ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبیؒ،امام، ترجمہ متن قرآن پیر محمد کرم شاہ الازہری، تفسیرِ قرطبی، ضیاء القرآن پبلیکیشنز(پاکستان)،2012ء

2۔احمد رضا خان صاحب بریلویؒ،اعلیٰ حضرت، محمد نعیم الدین مراد آبادی(تفسیر) کنزالایمان، حفیظ بک ڈپو (دہلی)

3۔امین احسن اصلاحیؒ،تدبّرِ قرآن، فاران فاؤنڈیشن(لاہور)،2009ء

4۔خالد سیف اللہ رحمانیؒ، مولانا، آسان تفسیر قرآن مجید، کتب خانہ نعیمیہ(دیوبند)،2015ء

5۔سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز(دہلی)،2011ء

6۔شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلویؒ(مترجم)، مولانا، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ(مفسر)، القرآن الکریم، قدرت اللہ کمپنی(لاہور)

7۔عبدالماجد دریابادیؒ، تفسیرِ ماجدی القرآن العظیم، پاک کمپنی(لاہور)

8۔محمد اشرف علی تھانویؒ، مولانا، تفسیر بیان القرآن، مکتبہ رحمانیہ(لاہور)

9۔محمد جوناگڑھیؒ، مولانا، حافظ صلاح الدین یوسف(تفسیر)، احسن البیان، دارالسلام(ریاض)

10۔محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی، معارف القرآن(جلد اول تا ہشتم)، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس(دہلی)، 1993ء

کتب

1۔ابنِ قیم، حافظ، جمع و ترتیب مولانا عبدالغفار حسنؒ، تفسیری نکات وافادات، البلاغ پبلی کیشنز(دہلی)، 2012ء

2۔ابوذر اصلاحی، ڈاکٹر، علامہ ابوالاعلیٰ مودودیؒ حیات وخدمات، اریب پبلیکشنز (دہلی)، 2013ء

3۔ابو مسعود عبدالجبار، عربی زبان وادب، علمی کتب خانہ (لاہور)، 2014ء

4۔احسان الحق، ڈاکٹر، اردو عربی کے لسانی رشتے، قرطاس (کراچی)، 2005ء

5۔اسرار احمد، ڈاکٹر، مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2010ء

6۔اسرار احمدؒ، ڈاکٹر، تعارفِ قرآن مع عظمتِ قرآن، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2015ء

7۔اسرار احمدؒ، ڈاکٹر، حکمتِ قرآن کی کی اساسات، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2015ء

8۔اسرار احمدؒ، ڈاکٹر، عظمتِ قرآن، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2013ء

9۔اسرار احمدؒ، ڈاکٹر، قرآنِ حکیم کی قوتِ تسخیر، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2012ء

10۔اسرار احمدؒ، ڈاکٹر، جماعتِ شیخ الہند اور تنظیمِ اسلامی، مکتبہ خدام القرآن (لاہور)، 1987ء

11۔اسعد گیلانیؒ، ڈاکٹر، مولانا مودودیؒ سے ملئے، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (دہلی)، 2010ء

12۔اسماعیل الطحان، ڈاکٹر، مترجم محمد رضی الاسلام ندوی، تاریخ تدوین وجمع قرآن، اسلامک بک فاؤنڈیشن (دہلی)، 2011ء

13۔اشہد رفیق ندوی، تعلیماتِ قرآن، اکیڈمی آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز (علی گڑھ)، 2008ء

14۔الطاف احمد اعظمی، تفسیر قرآن کے اصول ومسائل، مکتبہ الحسنات (دہلی)، 2010ء

15۔امتیاز احمد، ڈاکٹر، مولانا مودودیؒ کی نثر نگاری، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (دہلی)، 2010ء

16۔اقبال احمد فاروقی، علامہ، تذکرہ علماء اہلسنت لاہور، مکتبہ نبویہ (لاہور)، 1987ء

17۔امین احسن اصلاحیؒ، مولانا، مبادی تدبّر قرآن، البلاغ پبلی کیشنز (دہلی)، 2013ء

18۔امین احسن اصلاحیؒ، مولانا، اصول فہمِ قرآن، قرآن وسنت اکیڈمی (دہلی)، 2013ء

19۔پرویز امیر علی ہود بھائی، مسلمان اور سائنس، اریب پبلیکیشنز، 2012ء

20۔ تقی عثمانی صاحبؒ، مفتی، علوم القرآن اور اصول تفسیر، فرید بک ڈپو (دہلی)، 2005ء

21۔ جلال الدین سیوطیؒ، علامہ، الاتقان فی علوم القرآن، دار الاشاعۃ (کراچی)، 2008ء

22۔ جلیل احسن ندویؒ، مولانا، زادِ راہ، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (دہلی)، 2008ء

23۔ جلیل احسن ندویؒ، مولانا، تدبّر قرآن پر ایک نظر، ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح (یو۔پی)، 200ء

24۔ حسن الدین احمد، ڈاکٹر، قرآن فہمی آسان راستہ، ہمام پبلیکشنز (دہلی)، 1986ء

25۔ حسین احمد مدنی، مولانا، سفر نامہ شیخ الہندؒ اسیر مالٹا، دینی بک ڈپو (دہلی)، 1947ء

26۔ حمید الدین فراہیؒ، علامہ، ترجمہ خالد مسعود، تفسیرِ قرآن کے اصول، قرآن و سنّت اکیڈمی (دہلی)، 2003ء

27۔ حمید الدین فراہیؒ، امام، ترجمہ خالد مسعود، حکمتِ قرآن، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح (یو۔پی)، 2009ء

28۔ خرم مراد، قرآن کا راستہ، الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ (دہلی)، 2012ء

29۔ ذوالفقار احمد نقشبندیؒ، حضرت مولانا پیر، قرآن مجید کے ادبی اسرار و رموز، دار الکتاب (دیوبند)

30۔ ذوالفقار کاظم، ڈاکٹر، قرآن حکیم انسائیکلوپیڈیا، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2006ء

31۔ راغب الطباخ، ترجمہ افتخار احمد بلخی، تاریخ افکار و علومِ اسلامی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (دہلی)، 1982ء

32۔ رفیع الدین ہاشمی و سلیم منصور خالد، خطوطِ مودودیؒ (اول)، منشورات (دہلی)، 2012ء

33۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا، نکاتِ قرآنی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (دہلی)، 1988ء

34۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا، تمثیلاتِ قرآنی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (دہلی)، 1982ء

35۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا، الفاظِ قرآنی کا تفہیم، قرآن و سنت اکیڈمی (دہلی)، 2005ء

36۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا، شخصیات، ذکریٰ انٹر نیشنل پبلشرز (دہلی)، 2012ء

37۔ سید حمیرا مودودی، شجر ہائے سایہ دار، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (دہلی)، 2007ء

38۔ سید حامد علی، قرآنی اصطلاحات اور علمائے سلف و خلف، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (دہلی)، 2011ء

39۔ سید شاہد علی، ڈاکٹر، اردو تفاسیر بیسویں صدی میں، کتابی دنیا (دہلی)، 2009ء

40۔ سید شمس الحقؒ افغانیؒ، مولانا، علوم القرآن، المکتبہ الاشرفیہ (لاہور)

41۔ سید فضل الرحمٰن، معجم القرآن، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، 1984

42۔ سید قطب شہیدؒ، پروفیسر، قرآن کے فنی محاسن، فرید بک ڈپو (دہلی)

43۔ سید ممتاز علی، شمس العلماء مولانا، اشاریہ مضامین قرآن، الفیصل ناشران (لاہور)، 2008ء

44۔ سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا، تدوینِ قرآن، مکتبہ الحق (ممبئی)

45۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر مولانا محمد رفیق چودھری، الفوز الکبیر، مکتبہ قرآنیات (لاہور)

46۔ شمس الحق شہادت زئی، مولانا، مفردات القرآن، الفلاح (کراچی)، 2010ء

47۔ شوقی ابو خلیل، ڈاکٹر، اطلس القرآن، مکتبہ بیت السلام (یو۔پی)، 2012ء

48۔ صالحہ عبد الحکیم شرف الدین، ڈاکٹر، قرآن حکیم کے اردو تراجم، قدیمی کتب خانہ (کراچی)، 1981ء

49۔ صبحی صالح، ڈاکٹر، ترجمہ غلام احمد حریری، علوم القرآن، فرید بک ڈپو (دہلی)، 2003ء

50۔ صدر الدین اصلاحیؒ، مولانا، قرآن مجید کا تعارف، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (دہلی)، 2013ء

51۔ ظفر الاسلام اصلاحی، قرآنی مطالعات (سماجی، معاشی و سیاسی مسائل کے حوالہ سے)، اسلامک بک فاؤنڈیشن (دہلی)، 2014ء

52۔ عاصم نعمانیؒ، مولانا، مولانا مودودیؒ گفتار اور افکار، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (دہلی)، 2010ء

53۔ عبد الحکیم ملک، انجینئر، منشورِ قرآن، اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن (پاکستان)، 1996ء

54۔ عبد الرحمٰن ابنِ خلدون، رئیس المؤرخین علامہ، مولانا راغب رحمانی (مترجم)، مقدمہ ابن خلدون، نفیس اکیڈیمی (کراچی)، 2001ء

55۔ عبد الرحمٰن کیلانی، مولانا، مترادفات القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 2006ء

56۔ عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، مکتبہ رشدیہ لمٹید (لاہور)، 1983ء

57۔ عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا، مطالعہ قرآن بیسویں صدی میں، ھجرہ انٹر نیشنل پبلشرز (لاہور)، 1984ء

58۔ عبدالکریم ذاکر نائک، ڈاکٹر، قرآن اور جدید سائنس

59۔ عبدالکریم پاریکھؒ، مولانا، آسان لغات القرآن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی)، 1952ء

60۔ عبدالمغنی، پروفیسر، مولانا مودودیؒ کی ادبی خدمات، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (دہلی)، 1989ء

61۔ عبیداللہ فہد فلاحی، قرآن مبین کے ادبی اسالیب، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (دہلی)، 2000ء

62۔ علی اصغر چودھری، قرآن مجید اور دعوتِ غور و فکر، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2014ء

63۔ عمر احمد عثمانی، مولانا، فقہ القرآن (عبادات)، تاج کمپنی، 2011ء

64۔ غلام احمد حریری، پروفیسر، تاریخ تفسیر و مفسرین، تاج کمپنی، 2010ء

65۔ فضل کریم، پروفیسر ڈاکٹر، قرآن کے جدید سائنسی انکشافات، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2013ء

66۔ فیروزالدین، مولوی، فیروز اللغات، فیروز سنس (لاہور)

67۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، ترجمہ کا فن اور روایت، ایجوکیشنل بک ہاؤس (علی گڑھ)

68۔ لوئیس معلوف، ترجمہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، المنجد، مکتبہ قدوسیہ (لاہور)، 2009ء

69۔ متین طارق باغپتی، مولانا مودودیؒ اور فکری انقلاب، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی)، 1979ء

70۔ مجدی ہلالی، ڈاکٹر، مترجم رئیس احمد فلاحی، رجوع الی القرآن، ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح (یو۔پی)

71۔ محمد احمد مصباحی، مولانا، تدوینِ قرآن، المجمع الاسلامی (یوپی)، 1981ء

72۔ محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب، مولانا ڈاکٹر، حضرت شیخ الہندؒ: شخصیت، خدمات و امتیازات، مرکز الکوثر التعلیمی والخیری مراد آباد، 2014ء

73۔ محمد بہاؤالدین شاہ، امام احمد رضا اور علماء مکہ مکرمہ، اعلیٰ حضرت نیٹ ورک

74۔ محمد اسلم جیراجپوریؒ، مولانا حافظ، تاریخ القرآن، مطبع فیضِ عام (علی گڑھ)، 1929ء

75۔ محمد اقبال کیلانی، تعلیماتِ قرآن مجید، مکتبہ بیت السلام (ریاض)، 2006ء

76۔ محمد جاوید طفیل، نقوش قرآن نمبر (حصّہ اول تا چہارم)، فرید بک ڈپو (دہلی)، 2017ء

77۔ محمد حسین شمیم، سید مودودیؒ کے گمنام گوشے، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (دہلی)، 1998ء

78۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، تاریخ قرآن مجید، نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی (دہلی)، 2011ء

79۔ محمد حنیف ندوی، مولانا، مطالعہ ءقرآن، فرید بک ڈپو (دہلی)، 2005

80۔ محمد دلاور سلفی، قاری، امثال القرآن، صبح روشن (لاہور)، 2009ء

81۔ محمد راشد ایوب اصلاحی، ڈاکٹر، قرآن مجید میں نظم و ترتیب: ایک تجزیاتی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز (دہلی)، 2014ء

82۔ محمد سالم قدوائی، ڈاکٹر، ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، اسلامک بک فاؤنڈیشن (دہلی)، 2006ء

83۔ محمد شکیل اوج، ڈاکٹر، قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، البلاغ پبلی کیشنز، 2010ء

84۔ محمد عارف اعظمی عمری، تذکرہ مفسرینِ ہند (جلد اول و دوم)، دار المصنفین شبلی اکیڈمی (یو۔پی)، 2013ء

85۔ محمد عبد الرشید نعمانی، مولانا، لغات القرآن (اول، دوم)، مکتبہ حسن سہیل (لاہور)

86۔ محمد فاروق خان، مولانا، قرآنی مباحث، قرآن و سنت اکیڈمی (دہلی)، 2008ء

87۔ محمد عبد الحفیظ اسلامی، تعارف قرآن، الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ (دہلی)، 2013ء

88۔ محمد فاروق خان، مولانا، کلامِ نبوّت (اول تا پنجم)، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (دہلی)، 2007ء

89۔ محمد نسیم عثمانی، پروفیسر ڈاکٹر، اردو میں تفسیری ادب، عثمانیہ اکیڈمک ٹرسٹ (کراچی)، 1994ء

90۔ محمد روح اللہ نقشبندی، مولانا، عہدِ رسالت کے مفسرینِ کرام، دار الاشاعت (پاکستان)، 2010ء

91۔ محمد مجیب الرحمٰن، پروفیسر ڈاکٹر، برصغیر کا اسلامی ادب چند نامور شخصیات، نقوش، 2010ء

92۔ محمد نسیم صاحب، مولانا مفتی، منتخب لغات القرآن، دار الہدیٰ، 2009ء

93۔ محمد ولی رازی، مولانا، قرآن اور سائنسی انکشافات، مکتبہ الحق (ممبئی)، 2015ء

94۔ محمد یوسف بھٹا، مولانا مودودیؒ کی مختصر آپ بیتی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (دہلی)، 2008ء

95۔ محمود احمد غازی، ڈاکٹر، محاضراتِ قرآنی، اریب پبلیکیشنز (دہلی)، 2015ء

96۔ محمود احمد غازی، ڈاکٹر، قرآنِ مجید ایک تعارف، دعوہ اکیڈمی (اسلام آباد)، 2012ء

97۔ محمود احمد قادری، تذکرہ علماء اہلسنت، سنی دار الاشاعہ علویہ رضویہ، 1972ء

98۔ نظر زیدیؒ، ہمارے پیارے مولاناؒ، فاران (دہلی)، 2009ء

99۔ نعیم احمد، قرآنی معجزے، البلاغ پبلی کیشنز (دہلی)، 2010ء

100۔ نعیم صدیقی، المودودیؒ، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (دہلی)، 1992ء

101۔ وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ، مولانا، القاموس الجدید، کتب خانہ حسینیہ (دیوبند)، 2004ء

102۔ ہلوک نور باقی، ڈاکٹر، ترجمہ سید محمد فیروز شاہ، قرآنی آیات اور سائنسی حقائق، اسلامک بک فاؤنڈیشن (دہلی)، 1994ء

رسائل / جرائد

1۔ الشریعہ (گوجرانوالہ)

2۔ انوارِ رضاؒ، عظمتِ ابرار نمبر، انٹرنیشنل غوثیہ فورم، 2012ء

3۔ آیات، مرکز الدراسات العلمیہ (علی گڑھ)

4۔ ترجمان القرآن، ادارہ ترجمان القرآن (پاکستان)

5۔ سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر، ادارہ معارف اسلام (کراچی)، نومبر 1969ء

عربی کتابیں

1۔ عبدلقاہر بن عبدالرحمٰن الجرجانی، اسرار البلاغہ، دار الکتب العلمیہ (لبنان)، 2001ء

2۔ علی الجارم، مصطفیٰ امین، البلاغۃ الواضحۃ، دار المعارف

3۔ ف۔ عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، دروس اللغۃ العربیہ، اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ (چنئی)، 2000ء

انگریزی کتابیں

1. Ahmad Von Denffer, An introduction to the Sciences of The Quran (Uloom al Quran), Millat Book Center (Delhi), 1983.
2. Daoud Mohammad Nassimi, A Thematic Comparative Review of some English Translations of The Holy Qur'an (PhD Thesis), University of Birmingham (UK), 2008.
3. Mohammad Abdul Rahim, Similitudes in the Holy Quran, Islamic Book Service (Delhi), 2008

ویب سائٹس

1. http://toobaa-elibrary.blogspot.in/2013/07/1914.html
2. http://www.urdulibrary.org
3. www.besturdubooks.net
4. http://kitabosunnat.com/
5. http://shodhganga.inflibnet.ac.in/

QURAN MAJEED KE CHAND URDU TARAJIM KA MAUZUATI TAQABULI MUTALA'A

(Thematic Comparative Study of Some Urdu Translations of the Holy Quran)

Dissertation submitted in partial fulfillment of the requirements for the award of the Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN
TRANSLATION

By

SYEDA AYESHA PARVEEN

Under the Supervision of

DR. MOHAMMED KHALID MUBASHIRUZ ZAFAR

Dept. of Translation

School of Languages, Linguistics and Indology

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY, Hyderabad - INDIA

Year 2013-2018

قرآن مجید کے چند اُردو تراجم کا موضوعاتی تقابلی مطالعہ

تلخیص مقالہ برائے

پی۔ایچ۔ڈی مطالعات ترجمہ

سال 2013-2018

اندراج نمبر: A160985

مقالہ نگار

سیدہ عائشہ پروین

نگران

ڈاکٹر محمد خالد مبشر الظفر

شعبۂ ترجمہ

اسکول برائے السنہ، لسانیات وہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی۔ حیدرآباد

یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں موضوع کا تعارف اور اس کی ضرورت واہمیت پر بحث کی گئی۔

دو یا دو سے زائد افکار، مضامین، اشخاص، ادوار یا علاقوں کے مابین یکسانیت (Similarity) یا اختلاف (Difference) کے مطالعہ کا نام تقابلی مطالعہ ہے۔

تقابلی تحقیق ایک ایسا عمل ہے جس میں دو یا دو سے زائد اکائیوں کا تقابل اس مقصد سے کیا جائے کہ کسی ایک یا تمام تقابل کی جانے والی اکائیوں سے متعلق حقائق کا انکشاف کیا جائے۔ یہ ایک ایسی تکنیک ہے جس میں واحد مطالعہ میں مختلف شعبۂ جات سے مدد لی جاسکتی ہے۔

تقابلی مطالعہ کی مختلف تعریفات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ، تقابلی مطالعہ:

1۔ دو یا دو سے زائد مضامین یا افکار کے مابین یکسانیت یا اختلاف کو واضح کرتا ہے۔

2۔ دو یا دو سے زائد مضامین کے درمیان تعلق (Relationship) کی نوعیت کا تجزیہ کرتا ہے۔

3۔ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا دو مضامین یا افکار ایک دوسرے کے متضاد (Contradictory) ہیں یا ایک دوسرے کی اضافہ شدہ (Extended) شکل ہیں۔

4۔ ماضی کے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے حال اور مستقبل کے امکانی واقعات کی توضیح کی جاتی ہے۔

5۔ دو یا دو سے زائد مضامین کے درمیان علت و معلول (Cause and Effect) کے تعلق کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

6۔ دو یا دو سے زائد یکساں نوعیت کے گروہ (Similar Groups)، افراد (People) یا حالات (Conditions) کو تقابل کے ذریعہ پرکھا جاتا ہے، اس کے علاوہ منفرد خصوصیات کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

تقابلی مطالعہ میں کسی واقعہ، مضمون یا مسئلہ کے ہر پہلو پر غور و فکر، گہرے مطالعے اور تفہیم (Explanation) کے ذریعہ کچھ ایسے نتائج اخذ کرنا ہوتا ہے جس کا مقصد ماضی کے واقعات کی روشنی میں حال ی مستقبل کے امکانات

کی توضیح کرنا ہوتا ہے۔

موضوعاتی تقابلی مطالعہ

موضوعاتی تقابلی مطالعہ معیاری تحقیق کا ایک ایسا میدان ہے جہاں پر ایک موضوع کو لیکر زمانی و مکانی(Time and Space)بنیادوں پر تقابل کیا جاتا ہے۔موضوعاتی تقابلی مطالعہ میں کسی بھی ادب کے مطالعہ میں تہذیبوں، زبانوں اور ادوار کے مابین موضوعات کی بناپر تقابل کیا جاتا ہے۔

موضوعاتی تقابلی مطالعہ کے اطلاقات

تقابلی مطالعہ ہماری روز مرّہ زندگی کا حصّہ ہے۔اس کا اطلاق ہر میدان میں کیا جاسکتا ہے جیسے سماجی، مذہبی، تہذیبی، معاشی، اخلاقی، سیاسی اور جغرافیائی بنیادوں پر تقابلی تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر دو مذاہب کا تقابلی مطالعہ، ان میں خدا کا تصور، اخلاقی تعلیمات، عورت کا مقام جیسے موضوعات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا ان موضوعات میں یہ دو مذاہب یکساں ہیں یا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ایک دوسرے کے تضاد کی شکل میں سامنے آئے یا ایک دوسرے کی اضافہ شدہ شکل ہیں۔

اسی طرح شخصیات، ممالک، کتابوں اور زبانوں وغیرہ کے مابین مختلف موضوعات یا پیمانوں پر تقابل کیا جاتا ہے۔

قرآن کے اردو تراجم کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت واہمیت

اُردو برصغیر ہندو پاک میں کثرت سے استعمال ہونے والی زبان ہے۔یہاں مسلمانوں کی اکثریت قرآن کو سمجھنے کے لئے اردو تراجمِ قرآن پر ہی انحصار کرتی ہے۔ہر مترجم کا ترجمہ، اندازِ بیان، الفاظ کے انتخاب، مفہوم کی ترسیل اور علاقائی اثر میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔اس لئے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اب تک کے قرآنِ پاک کے ہونے والے تراجم کا جائزہ لیا جائے اور اہلِ علم کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جائے اور ان تراجم کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسی خصوصیات کی نشاندہی کی جائے جو آئندہ تراجم میں مزید بہتری لاسکے۔

کلام الٰہی میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانے کا ساتھ دیتا ہے جبکہ ترجمہ میں یہ بات نہیں ہوتی، اسکے علاوہ مترجم کی فکر اور رُجحانات کا ترجمہ پر جو اثر ہوتا ہے ان کا جائزہ لینے میں تقابلی مطالعہ سود مند ہے۔ ہر مترجم کی وسعتِ فکر و نظر مختلف ہوتی ہے جس کی بنا پر مختلف تراجم وجود میں آتے ہیں۔ تقابلی مطالعہ سے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ کونسا ترجمہ اصل سے قریب تر ہے۔ اسکے علاوہ تقابلی مطالعہ کی مدد سے قرآنی متن کے ایک سے زائد معنی سامنے آتے ہیں جو فہم قرآنی میں گہرائی پیدا کرتے ہیں۔

قرآن مجید کے اُردو تراجم کے تقابلی مطالعات: ایک تاریخی جائزہ

قرآن کے اردو تراجم کے تقابلی مطالعہ کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ یہ ایک نئی تحقیقی روش ہے جس کے ابتدائی نقوش سن 1982ء میں سامنے آئے۔ یہ ڈاکٹر حمید شطاری کا پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ ہے۔

1۔ "قرآن مجید کے اُردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ -1914ء تک"، پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ از ڈاکٹر سید حمید شطاری (ریڈر شعبہ ءاُردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد)۔ مطبوعہ 1982ء۔

اس مقالہ کو ادوار کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا۔ باب دوم سے تقابلی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں قدیم دکنی تراجم و تفاسیر 1115ھ مطابق 1703ء تک کے تراجم کا جائزہ لیا گیا۔ اس میں چار نثری اور ایک منظوم ترجمہ پر بحث کی گئی ہے۔ باب سوم میں 1703 تا 1789ء تک کے تراجم، باب چہارم میں 1789ء تا 1858ء اور باب پنجم میں 1858ء تا 1914ء کے تراجم کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا۔

اس مقالہ میں مخطوطات اور مطبوعات کو شمار کیا جائے تو 60 تراجم و تفاسیر پر تنقیدی کام کیا گیا۔ اس میں زیادہ تر چند خاص سورتوں کے ترجمے پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے ترجمہ کے آہنگ و اسلوب پر زیادہ توجہ دی ہے۔

اس مقالہ کو تقابلی مطالعہ کے تحت اس لئے شامل کیا کہ اس میں مقالہ نگار نے کئی مقامات پر دکنی تراجم کا دوسرے تراجم کے ساتھ تقابلی تجزیہ بھی کیا ہے۔ جس ترجمہ سے منتخب ترجمہ کا تقابل کیا گیا اس کی تخصیص نہیں کی گئی البتہ ایک ترجمہ کے مقابلہ میں دو یا تین معروف تراجم کو رکھ کر تجزیہ کیا گیا۔ ان تراجم میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمود حسنؒ وغیرہ کے ترجموں سے دکنی تراجم کا تقابل کیا گیا۔

2۔ "اُردو تراجمِ قرآن کا تقابلی مطالعہ" از پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری، ادارہ تحقیقاتِ احمد رضا انٹرنیشنل، سنِ اشاعت مارچ 2007ء۔

یہ کتاب 64 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے 10 مترجمین سر سید احمد خان علی گڑھیؒ، مولوی عاشق الٰہی میرٹھیؒ، مولوی فتح محمد جالندھریؒ، ڈپٹی نذیر احمد دہلویؒ، مولوی محمود حسن دیوبندیؒ، مولوی مرزا وحید الزماںؒ، مولوی اشرف علی تھانویؒ، امام احمد رضا محدث بریلویؒ، ابوالکلام آزادؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تراجم کا تقابل کیا ہے۔

صاحبِ کتاب نے ہر مترجم کے ترجمہ سے ایک یا دو آیات کا انتخاب کیا اور اس کا تقابل مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کے ترجمہ سے کیا اور ہر تجزیہ میں مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کے ترجمہ کو دوسرے تراجم کے مقابلہ میں زیادہ مناسب اور قابلِ ترجیح قرار دیا۔ تجزیہ میں زیادہ تر انھوں نے اُردو الفاظ کے استعمال اور ان کی ترکیب پر گفتگو کی ہے۔

3۔ "قرآن مجید کے آٹھ منتخب اُردو تراجم کا تقابلی مطالعہ" از ڈاکٹر محمد شکیل اوج، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، سنِ اشاعت اپریل 2010ء۔

یہ کتاب 264 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے آٹھ مترجمین مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ، مولانا ابو منصورؒ کے تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔

انھوں نے بلحاظِ معنویت، بلحاظِ لغویت اور بلحاظِ ادبیت و متفرقات کے عناوین سے الگ الگ ابواب میں تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کیا۔ مقالہ نگار نے اپنے تجزیہ میں بالکل غیر جانبداری کے ساتھ تمام تراجم کے تقابلی نتائج بیان کئے ہیں۔

4۔ "حضرت شیخ الہندؒ اور فاضل بریلویؒ کے ترجمہء قرآن کا تقابلی جائزہ" از مولانا قاری عبدالرشیدؒ، استاذِ حدیث و تفسیر جامعہء مدنیہ، لاہور۔ تاریخِ طباعت جولائی 2012ء۔

یہ کتاب 168 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں دو مترجمین کے اُردو ترجمہ قرآن کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے: شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (1852ء۔1920ء) اور احمد رضا خان بریلویؒ (1856ء۔1921ء)۔ یہ تقابلی

جائزہ سورۃ الفاتحہ (مکمل) اور سورۃ البقرہ کی ابتدائی 37 آیات پر مشتمل ہے۔ اس میں الفاظ کے استعمال پر لسانی بحث کی گئی۔ اس جائزہ میں مولانا محمود حسنؒ کے ترجمہ کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔

5۔ ان کتب کے علاوہ نومبر 2014ء سے ماہنامہ الشریعہ میں "اردو تراجم قرآن پر ایک نظر: مولانا امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں" کے عنوان سے ڈاکٹر محی الدین غازی کے سلسلہ وار مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ جن کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ ان مضامین میں عموماً تفہیم القرآن اور تدبّرِ قرآن کی غلطیوں کو زیر بحث لایا گیا جن کی مولانا امانت اللہ اصلاحی نے مذکورہ ترجموں پر نظر ثانی کے دوران نشاندہی فرمائی تھی۔ یہ مضامین نہایت باریک بینی سے عربی قواعد و اسالیب بیان کی ترجمہ میں منتقلی پر گہرا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ ان مضامین کے لکھنے کا مقصد قرآن کا ترجمہ اجتماعی مساعی سے کئے جانے پر زور دینا ہے۔

قرآن مجید کے اردو تراجم کا موضوعاتی تقابلی مطالعہ: چند عملی پہلو

سب سے پہلے میں نے چار مشہور تفاسیر کا انتخاب کیا جو درجِ ذیل ہیں۔

1۔ کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن، مترجم مولانا احمد رضا خان بریلویؒ (تفسیر نعیم الدین مرادآبادیؒ)

2۔ احسن البیان، مترجم مولانا محمد جوناگڑھیؒ (تفسیر حافظ صلاح الدین یوسفؒ)

3۔ تفہیم القرآن مترجم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

4۔ معارف القرآن، مترجم شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (تفسیر مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

میں نے اس مقالے میں درجِ ذیل موضوعات کا انتخاب کیا ہے:

- تمثیلات
- آیاتِ انفس و آفاق
- احکامات
- آخرت کا بیان

اس تقابلی مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہر موضوع سے متعلق آیات کے چند نمونے قرآن سے لیکر اسکے بالمقابل مندرجہ بالا مترجمین کے تراجم کے نمونوں کا آپسی تجزیہ کیا گیا۔ یہ تجزیہ درجِ ذیل پیمانوں پر کیا گیا ہے:

- الفاظ واصطلاحات کے استعمال میں کس مترجم نے وسیع معنوں میں ترجمہ کیا۔
- مفہوم کی منتقلی میں کس حد تک کامیاب رہے۔
- ترجمہ میں سیاق وسباق کا لحاظ کس حد تک کیا گیا۔
- مترجم کی فکر کا ترجمہ پر کیا اثر ہوا۔
- موضوع کے اعتبار سے طرزِ بیان کی انفرادیت کو ترجمہ میں کہاں تک ملحوظ رکھا گیا۔

ان پہلوؤں میں سے جس مقام پر جو پہلو اختلافی پہلو کی حیثیت سے سامنے آیا اسی پر تقابلی جائزہ پیش کیا گیا۔ ہر موضوع کے تحت تمام پہلو لازماً زیر بحث نہیں رہے۔

دوسرا باب قرآن کے تعارف اور فن ترجمہ سے متعلق ہے۔

اس باب میں قرآن کے تعارف کے تحت اسکے نام، زبان اور اسلوبِ بیان، عرب کے مشہور اسالیبِ بیان کے تعارف کے ساتھ قرآن کے اسلوب کی انفرادیت بھی بیان کی گئی ہے۔ اسکے علاوہ اعجازِ قرآن اور اسکے مختلف پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا گیا۔ اسکے اعجازی پہلوؤں میں فصاحت وبلاغت، قوتِ تاثیر و قوتِ تسخیر، نظمِ کلام، اسکے فنی محاسن اور صوتی اعجاز کو مختصراً بیان کیا گیا۔

قرآن کا نزول عربی مبین میں ہوا۔ جو حجاز کے بدوؤں کی فصیح و بلیغ زبان تھی اور یہی زبان عرب کے بازاروں اور میلوں کے توسط سے قریش میں رائج ہوئی اور ارتقائی منازل طئے کرتے ہوئے فصاحت وبلاغت کے نقطہ عروج پر پہنچ گئی اور قریش کی اسی ٹکسالی زبان کو عربی مبین کا درجہ حاصل ہوا، جس میں قرآن کا نزول ہوا۔

قرآن کا اسلوبِ بیان بھی عرب کے معروف اسالیبِ بیان یعنی قصیدہ، خطبہ، کہانت اور رسائل سے مختلف ومنفرد ہے۔ قرآن کی زبان میں ان تمام اسالیب کی خوبیاں جمع ہیں لیکن کسی بھی اسلوب کی مکمل پیروی نہیں کی گئی۔

قرآن نے شعر و نثر کے بہترین امتزاج سے ایک فنی نثر کی منفرد قسم سے متعارف کروایا جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

اس کا اسلوب معجزہ کی حد کو پہنچا ہوا ہے، نثر ہونے کے باوجود ایسا معجزاتی آہنگ اپنے اندر رکھتا ہے کہ شعر کی حلاوت و لطافت سے زیادہ شیرین ہے۔

اس کے علاوہ مقالہ میں قرآن کے اسلوبِ حذف اور ایجاز کا اسلوب، اسلوبِ التفات وغیرہ کا صرف تعارف پیش کیا گیا تاکہ قرآن کے ترجمہ کی مشکلات کا اندازہ ہو سکے۔ ان اسالیب کا تفصیلی بیان یہاں مطلوب نہیں ہے۔

قرآن کا اعجاز اور اسکے اعجازی پہلو

معجزہ عجز سے مشق ہے جسکے معنی عاجز کرنے کے ہیں۔ اصطلاحاً اس نشانی کو کہتے ہیں جو اللہ تعالی نے کسی پیغمبر کو نبوت کی صداقت کے لئے دنیا پر ظاہر کیا ہو۔ معجزہ میں تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے اولاً وہ امر جو ظاہر ہوا خارق عادت ہو اور دوسروں کے بس میں نہ ہو۔ ثانیاً کسی پیغمبر کے دعوٰی نبوت کے طور پر بھیجا گیا ہو اور اس میں چیلنج بھی ہو، ثالثاً ایسا ظاہر ہو کہ انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس تعریف کی روشنی میں نبی ﷺ کا اصل معجزہ قرآن ہی ہے جس کے مثل کلام لانے کا چیلنج آج بھی برقرار ہے۔

قرآن کے اعجازی پہلوؤں میں اس کی فصاحت و بلاغت کو نہایت اہم مانا گیا ہے۔ علمائے ادب کسی کلام کے فصاحت و بلاغت کے ضمن میں اس بات پر متفق ہیں کہ کلام واضح ہو، غیر مانوس الفاظ سے پاک ہو، کسی قسم کا ابہام اور پیچیدگی نہ ہو۔ اس میں ایسی تاثیر ہو کہ مقابل یا سامع کے دل کو متاثر کر سکے۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت، حروف واصوات اور الفاظ کی سطح سے لیکر ان کی ترکیب و ترتیب، ربط وارتباط اور داخلی نظم سب میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

قرآن کے مخاطب دو طرح کے لوگ ہیں اور ان دو مخاطبین کے لحاظ سے دو مختلف طرح کا اعجاز قرآن میں پایا جاتا ہے۔ پہلی نوعیت کا اعجاز اس کی لسانی خوبیاں ہیں جو نبی ﷺ کے اوّلین مخاطبین سے متعلق ہے۔ اور دوسری

نوعیت کا اعجاز قرآن کے علمی پہلوؤں سے متعلق ہے، جتنا لوگ اس پر غور و خوض کرتے جائیں گے، نئی نئی چیزیں سامنے آتی جائیں گی اور یہ قرآن کے اعجاز کا وہ پہلو ہے جو قیامت تک جاری رہیگا۔

اسکے بعد فن ترجمہ اور اس کی مشکلات پر گفتگو کی گئی ہے۔ جس میں ترجمہ کے اقسام و مسائل کا مختصر تذکرہ کے ساتھ ترجمہ قرآن کی ضرورت واہمیت، قرآن کے ترجمہ کے مشکلات اور کیا قرآن کا ترجمہ ممکن ہے، اس عنوان کے تحت علماء کے اقوال کی روشنی میں یہ دکھایا گیا کہ ترجمہ قرآن کے دوران قرآن کی ادبیت وانداز بیان متاثر ہوتا ہے اور ترجمہ میں تمام قرآنی مفاہیم کو سمیٹنا بھی مشکل ہے۔

اُردو میں ترجمہ قرآن کی مختصر تاریخ

مولوی عبدالحق کے مطابق دسویں صدی ہجری کے اوائل کے جزوی تراجم میں پارہ عم کا ایک ترجمہ اور اواخر میں سورہ یوسف کا گجراتی اردو میں ترجمہ دستیاب ہوئے۔ اس کے علاوہ صالحہ عبدالحکیم نے گیارھویں صدی ہجری میں عبدالصمد بن عبدالوھاب خانؒ کے مکمل ترجمہ کا ذکر کیا ہے جو 1087ھ مطابق 1676ء میں ترجمہ کیا گیا۔

اٹھارویں صدی میں شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ موضح القرآن (1205ھ /1790ء) سے قبل اردو میں پانچ ترجموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جو مطبوعہ نہ ہونے کی وجہ سے یا مترجمین کے غیر معروف ہونے کی وجہ سے تاریخ میں اپنا مقام درج نہیں کر پائے۔ اس طرح شاہ برادران کے تراجم کو اولین اردو تراجم کی حیثیت سے تاریخی حیثیت حاصل ہوئی۔ شاہ عبدالقادرؒ کے بعد شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ 1254ھ میں کلکتہ کے اسلامی پریس سے طبع ہوکر منظر عام پر آیا۔ اس طرح اردو تراجم قرآن کی ابتداء ہوئی اور صالحہ عبدالحکیم کے جائزہ کے مطابق اٹھارویں صدی میں مطبوعات و مخطوطات ترجموں کا شمار 17 ہے انیسویں صدی میں مکمل 64 اور جزوی 22 تراجم ہوئے۔ بیسویں صدی میں 100 سے زائد نثری تراجم اور 49 منظوم ترجمے ہوئے۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

باب سوم میں منتخب مترجمین کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

مولانا احمد رضا خان بریلویؒ

آپ 10 شوال 1272ھ/14 جون 1856ء شہر بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولانا نقی علی خانؒ بھی عالم دین تھے لہٰذا تیرہ برس کی عمر تک اپنے والد ماجد کے ہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ 14 سال کی عمر میں دستارِ فضیلت حاصل کی۔ آپ کی علمی خدمات میں صحیح بخاری، ترمذی، مسلم اور ابوداود کتبِ حدیث کی عربی میں حواشی کے علاوہ عربی زبان میں 37 کتابیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ "فتاویٰ رضویہ" 12 ضخیم جلدوں میں ہے جس میں اردو، فارسی اور عربی زبان میں فتاویٰ ہیں۔ آپ نے متعدّد سائنسی موضوعات پر بھی سو سے زائد رسائل لکھے۔ آپ نے عقائد و کلام پر بھی 120 سے زائد کتب تصنیف فرمائیں۔ تقریباً پچاس موضوعات پر ایک ہزار سے زائد کتابیں لکھیں۔ جن میں تفسیر، حدیث، عقائد، کلام و فقہ وغیرہ شامل ہیں۔

اسکے علاوہ ترجمہ قرآن "کنزالایمان فی ترجمتہ القرآن" بھی ان کی بڑی علمی خدمت ہے۔ یہ ترجمہ انھوں نے 13 ماہ کی مدت میں تکمیل کو پہنچایا جو 1911ء میں مکمل ہوا۔

مولانا محمد جوناگڑھیؒ

آپ کی پیدائش 1890ء میں گجرات کے ضلع کاٹھیاواڑ کے علاقہ جوناگڑھ میں ہوئی۔ آپ 'خطیب الہند' کے لقب سے مشہور تھے۔ دینی تعلیم کی ابتداء 22 سال کی عمر میں ا" مدرسہ امینیہ "دہلی میں داخلہ کے ذریعہ کی۔ بعدازاں صدر بازار دہلی کے معروف ادارہ "دارالکتاب والسنہ "میں شمولیت اختیار کی جس کے بانی عبدالوہاب دہلویؒ تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ محمدیہ قائم کئے اور ساتھ ہی ماہنامہ "گلدستہ محمدی "سے صحافتی خدمات بھی انجام دیں جو بعد میں اخبار محمدی کے نام سے پندرہ روزہ اخبار کی صورت میں 21 سال تک شائع ہوتا رہا۔ آپ کے علمی کارناموں میں تراجم و تصانیف کا گراں قدر سرمایہ ملتا ہے۔ عربی سے اردو تراجم میں تفسیر ابن کثیر اور حافظ ابنِ قیم کی "اعلام الموقعین" کے علاوہ 8 کتب کے ترجمے کئے۔ ان تراجم کے علاوہ سو سے زائد تصانیف کا تذکرہ ملتا ہے جن میں سے 72 کتابوں کے نام معلوم ہوئے۔ آپ کا اردو ترجمہ قرآن تفسیر ابن کثیر کے ساتھ ہے جو "تفسیر محمدی" کے نام سے ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

آپ کی ولادت 25 ستمبر 1903ء (1321ھ) میں حیدر آباد دکن (موجودہ مہاراشٹرا) کے شہر اورنگ آباد میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد سید احمد حسنؒ تھے۔ مولانا مودودیؒ کی ابتدائی تعلیم ان کے گھر پر ہی ہوئی۔ بچپن میں مولانا عبدالسلام نیازی صاحبؒ سے اکتسابِ فیض کیا۔ مولانا مودودیؒ نے نو دس سال کی عمر میں عربی ادب اور فقہ کی متعدد کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اسکے بعد 11 سال کی عمر میں مدرسہء فوقانیہ اورنگ آباد کی آٹھویں جماعت میں داخل ہوئے۔ یہاں پر کیمیاء، طبیعیات، ریاضی، جغرافیہ وغیرہ جدید علوم سے استفادہ کیا۔ 13 برس کی عمر 1914ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

مدرسہ دارالعلوم فتح پوری سے مولانا محمد شریف اللہ خان کے ہاں تفسیر بیضاوی، ہدایہ، علم معانی و بلاغت سیکھی اور سندِ فراغت حاصل کی۔ قیامِ دہلی کے دوران دوبارہ عبدالسلام نیازی صاحبؒ سے عربی ادب و انشاء، فلسفہ اور منطق کی تعلیم حاصل کی اور مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ کے ہاں جامع ترمذی، مؤطا امام مالک کا درس لیا۔ اسی دوران انگریزی سیکھی اور اتنی دسترس حاصل کی کہ فلسفہ، تاریخ، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات کا گہری نظر سے مطالعہ کر سکیں۔ آپ نے مختلف موضوعات پر سو سے زائد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ عربی سے اردو میں چار کتابیں ترجمہ کیں۔ اسکے علاوہ مولانا مودودیؒ کا اہم ترین ادبی کارنامہ ان کی تفسیر تفہیم القرآن ہے۔ یہ تفسیر 6 ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جو 30 سال کی مدت میں تکمیل کو پہنچی۔

مولانا محمود حسنؒ

آپ 1268ھ مطابق 1851ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علیؒ بھی عالم اور ادیب تھے۔ مولانا محمود حسنؒ کی تعلیم کی ابتداء 6 سال کی عمر میں ہوئی۔ 5 محرم الحرام 1283ھ مطابق 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ اور مولانا محمود حسنؒ بعمر 15 برس پہلے طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم میں داخل کئے گئے۔

1284ھ میں آپ نے کنزالد قائق اور مختصر المعانی کا امتحان دیا۔ 1285ھ میں مشکوۃ المصابیح، ہدایہ اور مقاماتِ حریری پڑھی۔ صحاح ستہ کا درس انھوں نے اپنے نامور استاد اور مشہور عالم مولانا قاسم نانوتویؒ سے لیا اور دو سال کی مدت میں 1289ھ میں اس کی تکمیل کی۔ 1290ھ میں تحصیلِ علم سے فارغ ہوئے اور قاسم نانوتویؒ سے دستارِ فضیلت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد 1291ھ میں استاد و مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے اور تادمِ حیات اسی جامعہ سے وابستہ رہے۔ درس حدیث آپ کا اہم میدان تھا۔ 1308ھ میں صدر مدرس کے منصب پر فائز ہوئے اور آخری عمر تک اسی منصب پر فائز رہے۔ اس طرح آپ نے 40 برس تک دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دی۔

آپ کے علمی کارناموں میں دس تصانیف ملتے ہیں۔ آپ کا اہم کارنامہ ترجمہ قرآن ہے انھوں نے یہ ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ "موضح قرآن" کو بطورِ نمونہ سامنے رکھ کر کیا اور اپنے ترجمہ کا نام بھی اسی کے وزن پر "موضح فرقان" رکھا۔ یہ ترجمہ دارالعلوم میں ربیع الاول 1327ھ مطابق اپریل 1909ء میں شروع کیا۔ 11/ جولائی 1918ء ترجمہ پایہء تکمیل کو پہنچ گیا۔

باب چہارم میں تمثیلاتِ قرآنی کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا۔

تمثیلات کے تحت آٹھ مثالوں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا۔ جن میں منافقین کی مثال (سورہ البقرہ، آیات 17،18)، حق و باطل کی مثال (سورۃ الرعد، آیات 17،18)، زندگی بعد موت کی مثال (سورۃ الاعراف، آیات 57،58)، دنیوی زندگی کی مثال (سورۃ الکہف، آیت 45)، مؤمن اور مشرک کی مثال (سورۃ الزمر آیت 29)، شرک کی مثال (سورۃ العنکبوت آیات 41تا43)، اللہ کے نور کی مثال (سورۃ النور آیت 35) اور کفار کے اعمال کی مثال (سورۃ النور آیات 39،40) شامل ہیں۔

تقابل کا طریقہ یہ اپنایا گیا ہے کہ تمثیل کے مکمل عربی متن کے بعد چاروں مترجمین کے اردو تراجم نقل کئے گئے۔ بعدازاں ،ان تراجم میں اختلافات کے گوشوں کا جائزہ لغوی، معنوی اور ادبی لحاظ سے کیا گیا۔ چونکہ ہر تمثیل میں ان تینوں زاویوں سے اختلاف کا پایا جانا ضروری نہیں اسلئے ان تینوں میں سے جو بھی پہلو اختلافی پہلو کی حیثیت سے سامنے آیا اسے مطالعہ میں پیش کیا گیا۔

تمثیلات کے تقابل سے درج ذیل نکات حاصل ہوئے۔

- تمثیلات ادبیت سے بھرپور ہوتی ہیں ان کا لفظی ترجمہ یا تحت اللفظ ترجمہ مفہوم کی ترسیل میں کمزور اور ادبی پہلو سے بھی غیر موزوں ہوتا ہے۔
- قرآنی تمثیلات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ دلائل سے بھرپور ہوتی ہیں یعنی بعض اوقات یہ تمثیل کے پیرائے میں ہی علمی موضوعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔اس طرح علمی و ادبی زبان کا بہترین امتزاج سامنے آتا ہے۔ جیسے زندگی بعد موت کی مثال کو مردہ زمین کے بارش سے لہلہا اٹھنے سے تشبیہ دی گئی تو ساتھ ہے اس میں ایسے حقائق بھی پوشیدہ ہیں جن سے پانی سے ہر چیز زندہ ہونے اور مٹی کے ذرات میں بھی زندگی ہونے کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ جس سے ہر لفظ کا معنی یہاں تک کہ ضمیر کے اشارہ کا ترجمہ میں برتنا انتہائی اہم ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھنا ہوتا ہے کہ ادبیت کا پہلو بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

باب پنجم میں آیاتِ انفس و آفاق کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا۔

یہ دراصل آفاق و انفس کی وہ نشانیاں ہیں جنھیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے غور و فکر اور تدبر پر ابھارنے کے لئے بیان فرمائی ہیں۔اس موضوع کے تحت سات 7 آیات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جن میں سورہ حٰم سجدہ آیات 11،12 (کائنات کا ارتقا)، سورہ حٰم سجدہ آیات 9،10 (پہاڑوں کی ساخت)، سورۃ الانبیاء آیات 30،31

(فلکیات)، سورۃ الفرقان آیت 53 (بحریات)، سورہ طٰہٰ آیت 53 (نباتات میں جوڑے)، سورۃ المؤمنون آیات 12 تا 14 (انسانی تخلیق کے مراحل) اور سورۃ القیامہ آیات 37 تا 39 (جنس کا تعین) شامل ہیں۔

ایسے علمی موضوعات پر مشتمل آیات میں الفاظ کے صحیح معنوں تک پہنچنا اور اصطلاحات کے وسیع مفہوم کو ہدفی زبان کے لفظوں میں سمیٹنا ایک چیلنج کے طور پر سامنے آیا ہے۔

قرآن کے علمی موضوعات کا ترجمہ کرتے وقت الفاظ و اصطلاحات کا ترجمہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس موضوع میں ترجمانی کے بجائے "ترجمہ" ہی حقائق سے قریبی مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس لئے کہ طرزِ ترجمانی میں جہاں مفہوم کو واضح کرنے کی گنجائش ہوتی ہے وہیں اصل متن کی کچھ باریکیاں چھوٹ جاتی ہیں۔ اور اصل متن میں جملہ کی ترکیب کا اعجاز ترجمہ کے متن میں واضح نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ ضمیر کا مرجع کی وضاحت کرنا بھی اہمیت کا حامل ہے۔

الفاظ و اصطلاحات کے متعدد مترادفات سے قریبی اور وسیع مفہوم ادا کرنے والے لفظ کا انتخاب یعنی ترجمہ میں جامعیت پیدا کرنا اہمیت کا حامل ہے۔ جیسے لفظ 'انبت' کے معنی 'جو کچھ زمین اگائے' ہے۔ اس کے لئے پیداوار کی مخصوص قسم 'سبزی' یا 'سبزے' کے بالمقابل 'زمین کی پیداوار' زیادہ وسیع مفہوم سمیٹے ہوئے ہے۔

ایک اور نکتہ جو میں نے اس تقابل میں محسوس کیا وہ قرآنی الفاظ کا اعجاز ہے، ایک لفظ ذو معنی، سہ معنی اور کثیر معنوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ان الفاظ میں ایسا دوام ہے کہ ہر زمانے کے علمی انکشافات میں اس کی تعبیر کی جاسکتی ہے، اسی موضوع کے تجزیہ کے دوران نئے ترجموں کی ضرورت و اہمیت کا بھی اندازہ ہوا۔

باب ششم میں آخرت کے بیان سے متعلق آیات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا۔

اس موضوع کے تحت پانچ مناظر آخرت کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جن میں جنّت کا منظر، جہنّم کا منظر، قیامت کا منظر، مراحلِ قیامت اور زندگی بعدِ موت سے متعلق آیات کا انتخاب کیا گیا۔ جن میں سورۃ

الدّھر، آیت 12تا22(جنت کا منظر)، سورۃ الھمزہ(جہنم کا منظر)، سورۃ التکویر، آیت 1تا14(قیامت کا منظر)، سورۃ الحاقہ، آیت 1تا3اور 13تا18(مراحلِ قیامت)، سورۃ الزلزال(زندگی بعدِ موت)شامل ہیں۔

آخرت سے متعلق جتنی آیات ہیں ان میں قوت تاثیر بہت نمایاں ہے۔ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا رعب و جلال جھلکتا ہے۔ان آیات میں صوتی آہنگ اور وزن خاص اہمیت رکھتا ہے جو قاری کے قلب پر تاثیر کو بڑھاتا ہے۔ ان آیات میں ادبیت کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ جنت کے مناظر میں پُر کیف اور دلکش احساس قاری کے دل میں پیدا کرنے کے ساتھ اسکے حقیقی ہونے کا احساس بھی پیدا کرتی ہیں۔ یہ مناظر قرآن کے بیانیہ میں بہت ہی متحرک ہیں اور ایسے فنی اعجاز کی حامل ہیں جسے ہر قاری محسوس کر سکتا ہے۔ قیامت اور جہنم کے مناظر سے ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے جس میں خوف و خشیت پیدا ہوتی ہے اور اسکے اثر سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور بدن پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔

یہ وہ فنی کمال ہے جس کو ترجمہ میں تمام متحرک تصاویر یا مناظر کے ساتھ منتقل کرنا مترجم کے اندر کمال ادبیت کا تقاضا کرتا ہے۔ تبھی اس کی تاثیر کچھ حد تک ترجمہ میں منتقل ہوتی ہے۔ کچھ حد تک اسلئے کہ قرآن کے صوتی آہنگ اور آیات کا خاص متناسب وزن ترجمہ میں برتنا ناممکن ہے جو تاثیرِ کلام کو دوگنا کر دیتا ہے۔

تشبیہ واستعارات کے ترجمہ میں ہدفی زبان کا اسلوب ترجمہ میں برتنا تاثیر کو بڑھاتا ہے۔آزاد ترجمانی کے ذریعہ کلام کو مؤثر بنانے میں اس درجہ احتیاط درکار نہیں ہے جس درجہ کی احتیاط احکامات و عقائد جیسے موضوعات میں درکار ہے۔اس مقام پر اصل چیز قاری پر عالم آخرت کی وہ تصاویر اس ڈھنگ سے پیش کرنا اہمیت کا حامل ہے جیسے وہ انھیں بچشم خود دیکھ رہا ہو۔اور اس سے اس کے برپا ہونے کی یقینی کیفیت اس کے دل میں پیدا ہو۔اس مقصد کے حصول میں تشبیہ واستعارات کا لفظی ترجمہ غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔

باب ہفتم میں آیاتِ احکامات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا۔

اس موضوع کے تحت نماز، جہاد، پردہ اور سود سے متعلق آیات کا انتخاب کیا گیا۔ جن میں سورہ بنی اسرائیل، آیت 78،79(نماز)، سورۃ الحج، آیت 39،40اور سورۃ البقرہ، آیت 190 تا

193(جہاد)، سورۃ النور، آیت 31 اور سورۃ الاحزاب، آیت 59(پردہ) اور سورۃ البقرہ، آیت 275تا279(سود) شامل ہیں۔

آیاتِ احکامات میں قرآن کا وضاحتی اسلوب نمایاں ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے جس کے لئے تشریح و تفسیر نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ آیاتِ احکامات نہایت واضح ہونے کے باوجود اس کی مکمل تفہیم اور ان پر عمل کرنے کے لئے تفصیل تشریح طلب ہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر نماز کے احکامات جتنے بھی مقامات پر آئے ہیں وہاں اوقاتِ نماز کی وضاحت ہی ملتی ہے۔ نماز ادا کرنے کا طریقہ قرآن میں نہیں بیان کیا گیا۔ اس حکم پر عمل کا دار و مدار احادیث کی روایات و سنتِ رسول ﷺ کی پیروی میں ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مترجم ایک دوسرے سے مختلف نقطہ ء نظر رکھتے ہیں۔ اس کا تعلق چونکہ تفسیر سے ہے اسلئے میں نے تفسیری نکات کو بھی تقابل میں شامل کیا ہے۔

میں نے اس موضوع کی باریکیوں میں قدم رکھنے اور کسی بھی رائے کو ترجیح دینے سے گریز کیا ہے۔ جہاں مترجم کے نقطہ ء نظر کا اثر ترجمہ پر ہوا اسی کو موضوعِ بحث لایا ہے۔ اور اسکے لئے توضیحی گفتگو پر اکتفا کیا۔